۷۸۶

مسلمانانِ ہند کی
حیاتِ سیاسی

(محمد مرزا دہلوی)

کتب خانہ علم و ادب دہلی

طبع اول — مارچ ۱۹۴۰ء — قیمت ۱؍عہ

وحدت قومی و استحکام ملی کے علمبردار
ہندوستانی مسلمانوں کے قائد اعظم کے نام!

فہرست

دیباچہ

۱۸۵۷ء کے بعد سے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست نئی نئی الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار رہی۔ اس لئے نہیں کہ حالات کا اقتضا یہی رہا۔ بلکہ اس لئے کہ یہ مسلمانوں کا دور انحطاط تھا اور اس میں قوائے ذہنی و دماغی میں انتشار پیدا ہو جانا لازمی امر تھا!

اس انتشار دماغی کے باعث مسلم سیاست میں جو نشیب و فراز پیدا ہوئے انہوں نے مسلم انفرادیت کو پارہ پارہ کر دیا، مسلمانوں کی وحدت قومی کا شیرازہ بکھیر دیا ——— مسلمان سیاسی حیثیت سے ہندوستان میں محض بے حقیقت ہو کر رہ گئے!!

تخریب کے بعد ہمیشہ تعمیر کا دور آتا ہے، مسلم سیاست بھی مدتوں پریشان اور متزلزل رہنے کے بعد آج ایک مرکز پہ قرار پکڑتی ہے اور نئے سرے سے اپنی تعمیر میں مصروف ہو جاتی ہے!

لیکن جن اجزا سے آج اس کی تعمیر ہو رہی ہے، ان کی حقیقی قدر و قیمت کا احساس، اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا جب تک حالات اور واقعات

کی روشنی میں اُس نشیب و فراز کا جائزہ نہ لیا جائے جو مسلم سیاست میں پیدا ہوتا رہا اور اُن مُسلّمات کا تجزیہ نہ کیا جائے جو مسلم انفرادیت میں انتشار کا باعث چلے آتے ہیں!

یہ کام بڑی ذمہ داری اور بڑے پھیلاؤ کا ہے اور مجھے ہرگز یہ دعوے نہیں ہے کہ ان چند اوراق میں اسے تمام و کمال سمیٹ سکا ہوں۔ مقصود ان اوراق کی اشاعت سے صرف اس قدر ہے کہ مسلم سیاست کا اختصار کے ساتھ اس طرح احاطہ کر دیا جائے کہ اس کا ہر دور نظروں کے سامنے آجاتے اور اُن سیاسی مُسلّمات پر بھی روشنی پڑ جائے۔ جن سے مسلم سیاست کی ترکیب ہوتی رہی ہے۔

توقع ہے کہ ان اوراق کی اشاعت کے لئے میری یہ معذرت قبول کی جائے گی!

محمد مرزا (دہلوی)

مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرتبہ کیا ہے ؟

یہ ایک نہایت اہم اور بہت ہی پیچیدہ سوال ہے جو اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کشمکش اقتدار ہی کے دوران میں پیدا ہو چکا تھا، لیکن سنجیدگی اور ذمہ داری کے ساتھ اس کے حل کرنے کا ہوش ۱۸۵۷ء کے بعد ہی آیا اور وہ بھی اس وقت جب حوادث روزگار کی پیہم ٹھوکروں سے ہندوستان کا مسلمان لب گور پہنچ چکا تھا اور اس کے جینے کے لالے پڑ گئے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ نو سو برس حکمراں قوم کی حیثیت سے زندگی گذارنے کے بعد اس قدر جلد ہندوستانی مسلمان کو اُس پستی اور ذلت کا احساس دلانا بہت مشکل تھا جو اس کے لیے مقسوم ہو چکی تھی اور اس خطرے سے اُسے فی الفور باخبر کرنا اس سے زیادہ مشکل تھا جو ایک بدگمان فاتح اور ایک نابوچی اکثریت کے معاندانہ انداز سے خود اس کے وجود کے لیے پیدا ہو گیا تھا۔

ایک اُسے نیست و نابود کر دینے پر آمادہ تھا۔ اس لیے کہ اس کے قیام اقتدار میں سب سے بڑا روڑا مسلمان تھا اور دوسرا اس کی انفرادیت ہی کو ختم کر دینے پر تلا ہوا تھا، اس لیے کہ مسلم انفرادیت جدید قومیت کی تعمیر میں سنگ راہ بنی ہوئی تھی،

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی، ہر فاتح اپنے مفتوح کو پست کر دینا چاہتا ہے اور ہر انقلاب کا یہ لازمی نتیجہ ہوتا ہے کہ پست تر قوتیں بھی ایک بار ابھر آئیں۔ چنانچہ ہندوستان میں بھی

انقلاب کا بھنور بنا اور ہندوستانی مسلمان اُس بھنور میں گھر گیا۔ اگرچہ اپنے گھر جانے کا احساس مسلمان کو بہت دیر میں ہوا۔ لیکن جب ہو گیا تو اس نے پوری سرگرمی کے ساتھ اپنے قومی وجود کو بچانے اور اس انقلاب کے بھنور سے صحیح سلامت نکل آنے کی جد و جہد شروع کر دی ——— اسی جد و جہد سے دراصل ہندوستان میں جداگانہ مسلم سیاست کی داغ بیل پڑتی ہے۔

سلطنت مغلیہ کا زوال آناً فاناً نہیں ہوا بلکہ اورنگ زیب کے بعد بھی کامل ڈیڑھ سو برس اس سلطنت کا نام صفحہ ہستی پر باقی رہا ہے ——— یہی ڈیڑھ سو برس کا زمانہ مغلوں کے لئے عرصہ زوال، اور ہندوستان کے لئے "زمانہ انقلاب" تھا۔

مغلوں کو کمزور پاکر، ہندوستان کی محکوم طاقتیں ابھر آئیں، اور ہندوستان کی ہمسایہ سلطنتوں نے بھی اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ اور دلی کی تاراجی اسی عہد زوال کی ایک تلخ یادگار ہے۔ اور ملک کی اندرونی شورشوں میں پایۂ تخت پر مرہٹوں کی یورش، پنجاب میں سکھوں کی تاخت، وسطی ہند میں ڈاکوں اور ٹھگوں کی گرم بازاری، جنوبی اور مشرقی ہند میں انگریزی اور فرانسیسی تجارتی کمپنیوں کی شیطانی چالبازیاں۔ اور ہندوستانی روساء کی آپس کی رقابتیں اسی دور انقلاب کے وہ انمٹ نقوش ہیں جو سیاسیات ہند میں اب تک ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس طوائف الملوکی کے عالم میں بہار اور اودھ کے علاقوں سے اصلاح مذہب و معاشرت کے نام سے دو نئی تحریکیں اٹھیں اور شمالی ہند میں بہت جلد اپنا ایک حلقۂ اثر بنا لینے میں کامیاب ہو گئیں۔ اگرچہ یہ خالص مذہبی تحریکیں تھیں اور ان کی تبلیغ و اشاعت بھی مذہبی انداز پر ہوتی تھی لیکن اس کے باوجود ان کے اثر سے شمالی ہند کے مسلمانوں کے سیاسی زاویوں میں بڑی

حدتک تبدیلی واقع ہوگئی۔

پہلی تحریک مولوی شریعت اللہ نے بہار اور بنگال میں شروع کی، اس تحریک کا نام "فرائضی" تھا اور اس کا مقصد وحید مزدوروں اور کاشتکاروں میں بیداری پیدا کرنا اور انہیں اپنے مذہبی اور دنیاوی فرائض سے آگاہ کرنا تھا۔ اس تحریک کی عمر بہت مختصر ثابت ہوئی اور حلقہ اثر بھی بہار اور بنگال کے بعض مقامات سے آگے نہ بڑھ سکا لیکن دوسری اصلاحی تحریک جو مولوی سید احمد صاحب بریلوی کی قیادت میں اودھ سے شروع ہوئی وہ سارے شمالی ہندوستان میں پھیل گئی اور اسی نے مسلمانوں کے سیاسی نظریوں کو متاثر بھی کیا۔ یہ تحریک عرف عام میں (انگریزوں کے قول کے مطابق) "وہابی" کہلاتی ہے۔ ابتدائً اس تحریک کا مقصد مذہبی اور معاشرتی اصلاح سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا لیکن بہت جلد مسلمانان ہند کے مذہبی حقوق کے حفاظت کی ذمہ داری بھی اس سے متعلق ہوگئی۔ اور مولوی سید احمد بریلوی کے پیرووں کا یہ گروہ اپنی اس "مذہبی ذمہ داری" کو پورا کرنے میں ہمہ تن سرگرم عمل نظر آنے لگا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی جو اب ہندوستان میں حاکمانہ حیثیت اختیار کر چکی تھی، جنوبی اور مشرقی ہند سے مسلمانوں کے اقتدار کو قائم کرکے اودھ اور دہلی تک اپنا اثر قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ مسلمانوں سے سخت بدگماں تھی، اس لئے کہ ہندوستان میں اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے اُسے قدم قدم پر اُن سے دست وگریباں ہونا پڑا تھا اور کمپنی کی اس کامیابی کے بعد بھی جو اُسے اپنی شیطانی سازشوں اور سیاسی چالبازیوں کے باعث حاصل ہو چکی تھی صرف مسلمانوں ہی سے یہ خطرہ تھا کہ ہندوستان میں اگر کوئی قوم اسے دعوت مبارزت دے سکتی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں۔ چنانچہ ۸ مارچ ۱۸۳۸ء کو کلکتہ میں یہ اعلان کیا گیا تھا کہ:۔

"مسلمانوں کی سلطنت تو نہایت حقیر و ذلیل ہو گئی۔ ہندوؤں سے ہمیں کوئی خوف نہیں ہے اگرچہ لوگ ہمیں یہ صلاح دیتے ہیں کہ مسلمانوں کو تقویت دیکر ہندوؤں کی

قوت کو مغلوب کرنا چاہئے مگر یہ تدبیر درست نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم جو کام کریں وہ ہندوستان کو ناگوار ہوں۔ اور سلطنت جو برسر زوال ہے وہ حقیقت میں ہماری رقیب اور قلبی دشمن ہے اس کے حامی اور مددگار ہوں“ (مسلمانوں کا روشن مستقبل)

خطرے کے اسی احساس کے باعث کمپنی کا رویہ مسلمانوں کے حق میں بہت سخت بلکہ معاندانہ تھا۔ اور اس احساس کے باوجود کہ:۔

”عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندوان کے سامنے بالکل طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت بھی زیادہ ہوتی ہے“۔

(بغاوت ہند از ٹامس ہرنگٹن (بہ حوالہ روشن مستقبل)

مسلمانوں کو کمپنی کی حکومت میں دخیل ہونے کا ہرگز کوئی موقع نہیں دیا جاتا تھا اور نہ مسلمانوں کی صلاحیتوں کا علانیہ اعتراف کیا جاتا تھا۔ لارڈ میکالے لکھتا ہے کہ:۔

”کلایو کسی مسلمان کو بنگال کے کسی محکمہ انتظامی کا سردار بنانے کے بہت خلاف تھا“ (روشن مستقبل)

بلکہ اس کی پالیسی یہ تھی کہ رشوت دیکر، سازش کر کے، نفاق ڈلوا کر یا دورخی چال چلکر غرض جس طرح بھی ہو سکے مسلمانوں کی قوت کو توڑا جائے اور انہیں اس قابل نہ رہنے دیا جائے کہ کسی وقت بھی یہ اُبھر سکیں اور اپنی اس شیطانی پالیسی کی تکمیل اس طرح کی کہ کتابوں اور اخباروں میں پروپگنڈے کے ذریعہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو ابھارنا، اور مسلمان بادشاہوں کے مظالم کے افسانہ گھڑ کر ہندوؤں کے جذبات کو مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو شہ دیکر مسلمانوں کے مقابل کر دیا جائے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کا سر توڑتے رہیں اور کمپنی بہادر بے کھٹکے حکومت کرتی رہے۔ سر ہنری ایلیٹ جو کمپنی کی حکومت میں محکمہ خارجہ کے سکریٹری تھے ۱۸۴۹ء میں ”تاریخ ہندوستان“ لکھتے ہیں اور

اس تاریخ کے دیباچہ میں فرماتے ہیں :-

"ہندو مصنفین پہ مجھے بڑا افسوس ہوتا ہے ان لوگوں سے ہمیں یہ توقع تھی کہ اپنی قوم کے احساسات، توقعات اور معتقدات ہمیں بتائیں گے لیکن وہ اپنے ملک (شاہی) احکام و ہدایات کے مطابق لکھتے ہیں محرم کے مہینے کو "محرم شریف" اور قرآن کو "کلام پاک" کہتے ہیں اور اپنی تحریروں کو "بسم اللہ" سے شروع کرتے ہیں"

اس کے بعد ہندوؤں کو شہ دیتے ہوئے اور ان کے جذبات کو مشتعل کرتے ہوئے سہ مغربی کہتے ہیں :-

اب جبکہ ہندو اپنے ظالم (مسلمان) آقاؤں کے چنگل سے آزاد ہو گئے ہیں اور بے روک ٹوک اپنے دل کی باتیں ظاہر کر سکتے ہیں تب بھی ان غلامانہ ذہنیت کے لوگوں میں سے ایک بھی ایسا نہیں پیدا ہوا جو اپنے ملک کے صحیح احساسات کو قلمبند کر سکے یا طویل زمانہ کی مظلومیت کی کیفیات اور جذبات کا اظہار کر سکے"

ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اسقدر بھڑکا چکنے کے بعد انہیں خیال آتا ہے کہ اپنی حکومت کا پروپگنڈا تو رہ ہی گیا چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اگرچہ پرانی تاریخوں کی قدر و قیمت کم ہے تاہم بغور مطالعہ کرنے سے ان میں بہت سا مواد مل سکتا ہے اُن کے ذریعہ جہالت کا دھند دور کیا جا سکتا ہے جس نے ہندوستان کی معلومات کو تاریک کر رکھا ہے اور یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد کی تاریخ ابھی لکھنی باقی ہے اس سے رعایا کو ان بیشمار فوائد کا احساس کرایا جائیگا جو ہماری قوم اور منصفانہ حکومت سے حاصل ہوئے۔

اب ہم ان شاندار "اہروؤں" کی نہ سنیں گے جنہیں ہماری حکومت میں حد درجہ کی آزادی اور بہت سے سیاسی حقوق حاصل ہیں جو کبھی کسی مفتوح قوم کو آج سے پہلے نہیں ملے۔

جو لوگ ملکی ہمدردی کا رونا روتے ہیں اگر وہ تاریخ قدیم کی ورق گردانی کریں تو انہیں معلوم ہو جائیگا کہ جس زمانہ کے واپس آنے کی وہ تمنا کرتے ہیں اس میں اگر وہ محض زبان ہی سے ان لغویات کا اعتبار کرتے تو انہیں سیسہ پلا دیا جاتا یا زندہ دیوار میں چن دیا جاتا۔

اب ہم "افتادہ آراضی" کی ضبطی کے سلسلہ میں کسی قسم کا شور و غوغا سننے پر مجبور نہ ہوں گے کیونکہ پہلے بھی کوئی ملکیت ایسی نہ تھی جو قانوناً ضبط نہ ہو سکتی ہو یا ضبط نہ ہوتی ہو" (مسلمانوں کا روشن مستقبل)

مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈے کا یہ انداز ان لوگوں کا تھا جو کمپنی کی حکومت کے ذمہ دار عہدہ دار کہلاتے تھے اور جو اپنی تحریری ذمہ داریوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو حکومت اور سماج کی ذمہ داریوں سے بری تھے مسلمانوں کے خلاف پروپگنڈا کرنے میں معمولی احتیاط کے بھی قائل نہ تھے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق جلد دوم میں اس زمانہ کے ایک ایسے ہی انگریز مورخ کا بلا اظہار نام یہ قول نقل کیا ہے:۔

"ہندوستان کے مسلمان ذلیل ترین امت محمد (صلعم) سے ہیں اور قرآن کے مسئلوں اور ہندوستان کی بت پرستی سے مل ملا کر ان کا مذہب ایک عجیب مجموعہ بن گیا ہے" (روشن مستقبل)

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کے اس معاندانہ انداز اور ہندوں کو شہ دینے والی پالیسی سے ہندو اکثریت کی بڑی حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے نئے سرے سے اپنے آپ کو منظم کرنا شروع کیا اور کمپنی نے اس سلسلہ میں ہندوں کی پوری طرح مدد کی۔

ہندوؤں کی تنظیم جدید اگر تعصب اور سنگدلی سے پاک ہوتی تو یقیناً مبارک کہی جاسکتی تھی لیکن انگریزوں کی شہ پاکر ہندوؤں نے تنظیم جدید کے نام سے سارے ہندوستان میں خاموشی کے ساتھ جو تحریک شروع کردی وہ دراصل مسلمانوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ تھا۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تہذیب و تمدن۔ زبان و ادب حکومت اور معاشرت کے جو بھی نقوش پائے جاتے ہوں ایک ایک کرکے مٹا دیئے جائیں اور ان کے بجائے پراچین تہذیب، قدیم زبان اور خالص ہندو معاشرت کی ترویج کی جائے۔

ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کا بیج پڑ گیا، اور کمپنی کا اصلی مقصد پورا ہوگیا۔

اسی دوران میں جبکہ کمپنی کی طرف سے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی شیطانی چالیں پوری کامیابی سے چلی جارہی تھیں، مولوی سید احمد بریلوی نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کر دیا ——— بلی کے بھاگوں گویا چھینکا ٹوٹا!

مسلمانوں کا خیال بٹ گیا، کمپنی کے بجائے ان کی توجہ کا مرکز سکھ ہوگئے ایک طرف مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو ٹھکانے لگانے اور دوسری طرف سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کی جواب کمپنی کے اقتدار پر اثر انداز ہونے لگی تھی اس سے بہتر اور کیا صورت ہوسکتی تھی؟۔

چنانچہ جب سید احمد صاحب بریلوی نے جہاد کی تیاریاں شروع کیں تو کمپنی کے حکام نے ان تیاریوں میں نہ صرف کوئی مداخلت نہیں کی بلکہ الٹی جہادیوں کی مدد کی۔

لفٹننٹ گورنر اودھ نے جہاد کی تیاریوں کا حال سُن کر کہا:۔

"جب تک انگریزی عملداری میں کسی فتنہ وفساد کا اندیشہ نہ ہو ہم ایسی تیاری کے مانع نہیں ہیں" (روشن مستقبل)

اور سر سید احمد خاں انسٹی ٹیوٹ گزٹ (۲۰ دسمبر ۱۸۷۱ء) میں ان تیاریوں اور

کمپنی کی امداد کا حال اس طرح لکھتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں علی العموم مسلمان لوگ عوام کو سکھوں پر جہاد کرنے کی ہدایت کرتے تھے ہزاروں مسلح مسلمان اور بے شمار سامان جنگ کا ذخیرہ سکھوں پر جہاد کرنے کے واسطے جمع ہو گیا مگر جب صاحب کمشنر اور صاحب مجسٹریٹ کو اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حکومت کو اطلاع دی حکومت نے صاف لکھا کہ تم کو دست اندازی نہ کرنی چاہیئے . . . .

دہلی کے ایک مہاجن نے جہادیوں کا روپیہ غبن کیا تو مسٹر ولیم فریزر کمشنر دہلی نے اس کے خلاف ڈگری دی اور یہ روپیہ وصول ہو کر جہادیوں کو سرحد بھیجا گیا۔ (روشن مستقبل)

جہاد شروع ہو گیا اور تقریباً چھ برس تک مسلسل جہاد کرتے رہنے کے بعد مولوی سید احمد بریلوی شہید ہو گئے، لیکن جہاد بدستور جاری رہا، بالکل اس طرح جیسے کوئی مقدس مشغلہ ہندوستان کے مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہو:۔

"مجاہدین ہر سال انگریزی علاقوں سے پُرجوش دینداروں کو اپنی جماعت میں بھرتی کرتے رہتے تھے اور ہم اپنی رعایا کے ان مذہبی دیوانوں کو ان مجنونوں کی آبادی میں جانے سے روکنے کے لئے کوئی احتیاط نہ کرتے تھے یہ لوگ اپنا غصہ سکھوں پر اتارا کرتے تھے سکھوں کی جماعت وہ تھی جو مختلف اقوام کا غیر یقینی مجموعہ تھی جو کبھی ہماری دشمن اور کبھی دوست ہو جاتی تھی"

صوبہ متحدہ کے انگریز کارخانہ دار تیل کا بیان ہے کہ اس کارخانہ میں کام کرنے والے دیندار مسلمان اپنی تنخواہ یا مزدوری کا ایک جزو "ستھانہ کیمپ" (مجاہدین کے پڑاؤ) کے لئے علیحدہ کر کے رکھ لیتے تھے۔ جو لوگ زیادہ جری تھے وہ تھوڑے بہت زمانہ کے لئے ستھانہ جا کر خدمت کرتے تھے۔ جس طرح ہندو ملازم اپنے بزرگوں کے شرادھ کے لئے چھٹی مانگتے تھے اسی طرح

مسلمان ملازم یہ کہہ کر چند ماہ کی رخصت لے لیتے تھے کہ انہیں فریضہ جہاد ادا کرنے کیلئے نئے مجاہدین کے ساتھ شریک ہونا ہے (مسلمانان ہند مصنفہ ڈاکٹر ہنٹر بحوالہ روشن مستقبل)
ایک مدت تک یہ سلسلہ جاری رہا اور سکھ بھی مسلمانوں کے مسلسل حملوں سے گھبرا اٹھے کمپنی کی حکومت نے جب دیکھا کہ مسلمانوں نے سکھوں کو کافی نرم کر لیا ہے تو:-

"کپتان ایبٹ نے جو رزیڈنٹ لاہور کا اسٹنٹ تھا سردار چتر سنگھ سکھ کو بہت تنگ کر کے اُسے مقابلہ پر مجبور کیا اور صوبہ ہزارہ کے مسلمانوں میں جن کی آبادی بہت تھی اور جو جنگجو بھی تھے روپیہ تقسیم کر کے ان سے کہا کہ سکھوں نے مسلمانوں پر جو مظالم کئے تھے اس کا تمہیں بدلہ لینا چاہیے اس طرح سرحد کے مسلمانوں کو سکھوں کے مقابلہ میں کھڑا کر دیا۔ (روشن مستقبل)

جب اس ترکیب سے سکھوں کو پوری طرح الجھا لیا تو آخر کار ۱۸۴۵ء میں کمپنی نے پنجاب پر چڑھائی کر دی اور سکھوں کو شکست فاش دیکر سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔

***

پنجاب کی فتح کے ساتھ ہی مسلمان مجاہدین سے حکومت کی دلچسپی بھی ختم ہو گئی۔ اب وہ اس کی بھی روادار نہیں رہی کہ ہندوستان سے جو مسلمان مجاہد سکھوں سے جنگ کرنے سرحد گئے ہوئے تھے وہ وہاں سکونت اختیار کر لیں۔ حکم ہوا کہ ہندوستان کے مجاہدین سرحد چھوڑ کر ہندوستان واپس چلے جائیں اور پانچ برس تک سرحد کا رخ بھی نہ کریں اسلئے کہ اب پنجاب اور سرحد میں کمپنی کی عملداری تھی اور کمپنی اپنی عملداری میں جب تک اچھی طرح اقتدار نہ قائم ہو جائے مجاہدین کو باقی رکھنا بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھتی تھی، مجبوراً مجاہدین ہزاروں کی تعداد میں ہندوستان واپس ہوئے لیکن یہاں آکر انہوں نے دیکھا کہ پندرہ بیس برس ہی کے عرصہ میں ہندوستان کی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

ملک میں افلاس کا دور دورہ ہے، مسلمان انتہائی ذلت و فلاکت کو پہونچ گئے ہیں

ہر قسم کی معاش کے دروازے ان پر بند ہیں اور کمپنی پہلے سے زیادہ نادری انداز سے ملک پر حکمران ہے۔

البتہ ہندو بھائیوں میں کافی چونچالی نظر آتی تھی بلکہ ان میں زندگی کی نئی روح محسوس ہوتی تھی، ان کی سماجی اور سیاسی حیثیت بھی ترقی کر گئی تھی، ہندوستان کی معاشیات میں بھی انہیں دخل حاصل ہو گیا تھا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کمپنی کی حکومت سے مانوس ہو چلے تھے اور کمپنی نے از راہ عنایت انہیں اپنے نیاز مندوں میں شامل کر لیا تھا لیکن مسلمان کا ان کے پاس بھی گذر نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی پچھلی زندگی کا ورق الٹ دیا ہے اور مسلمانوں کا وجود نو سو برس کی یکجائی کے بعد بھی ان کے لئے ہندوستان کی سرزمین پر اجنبی سا ہو گیا ہے۔

برادران وطن کی اس سرد مہری میں مسلمانوں کے لئے عبرت و بصیرت کا ایک دفتر پنہاں تھا لیکن سادہ لوح مسلمان جو آنچ پیچ کی بات مشکل سے سمجھتے ہیں برادر وطن کے اس انداز کو بہ یک نظر سمجھ نہ سکے۔ ایک تو پے در پے حزیمتوں سے ان میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہو گئی تھی دوسرے متواتر آلام و انکار اور نکبت و افلاس نے ان کا دماغی توازن بگاڑ دیا تھا۔ چنانچہ ان تاریک حالات کا قدم جما کر پامردی سے مقابلہ کرنے کے بجائے ان کا واحد علاج مسلمانوں کے دیندار طبقہ کو یہ سوجھا کہ اس ملک ہی سے ہجرت کر جائیں، افغانستان، ایران، عراق و عرب کی طرف۔ لیکن ان مقامات کے مقابلہ میں علاقہ سرحد قریب تر تھا، اور یہاں کے راستوں سے ہندوستانی مسلمان مانوس بھی ہو چکے تھے اسی کے ساتھ حکومت نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سرحدی علاقوں میں آنے کی جو مدت مقرر کی تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی اس لئے دیندار (یعنی وہ مسلمان جو مولوی سید احمد بریلوی کے پیرو تھے) مسلمانوں کا کارواں پھر سرحد کی طرف چل پڑا۔ حکومت نے اب بھی ان جانے والوں کو نہ روکا البتہ یہ کیا کہ سرحدی مہاجرین سے ہندوستانی مسلمانوں کو تعلقات قائم رکھنے سے منع کر دیا۔ یہ کڑی شرط تھی، جہاد کے

زمانہ میں جو مسلمان مجاہدین کے ساتھ حکومت کا طرزِ عمل دیکھ چکے تھے، یہ نیا حکم ان کی سمجھ سے باہر تھا، ان میں سے بعض نے مجاہدین کے ساتھ اسی طرح کے تعلقات رکھنے چاہے لیکن اب کہ حکومت بھی یہ طے کر چکی تھی کہ مسلمانوں کی اس تحریک کو کچل ڈالے چنانچہ اس نے ان لوگوں کو گرفتار کرکے جنہوں نے مجاہدین سرحد سے تعلقات قائم رکھے تھے ان پر بغاوت میں مقدمہ چلا دیا اور ان میں سے پانچ کو پھانسی کی سزا سنادی جو بعد کو بمشکل کالے پانی کی سزا میں تبدیل ہوسکی۔ حکومت کے اس رویہ نے جو کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف تھا مسلمانوں کے دیندار طبقہ میں سخت بےچینی پیدا کردی، لیکن اب یہ لوگ بےبس و مجبور تھے ان کی طاقت فنا ہو چکی تھی اور ان میں اسقدر سکت بھی نہیں رہی تھی کہ حکومت کے اس طرزِ عمل کے خلاف کوئی موثر احتجاج بھی کرتے۔ ابھی یہ لوگ حکومت پر اپنے غم و غصہ کے اظہار کی کوئی مناسب تدبیر ہی سوچ رہے تھے کہ ایک تازہ آفت ان پر نازل ہوئی اور وہ ایک نئی مصیبت میں گرفتار ہوگئے۔

⁂

جنوری ۱۸۵۷ء میں کلکتہ میں یہ افواہ پھیلی کہ حکومت نے دیسی سپاہیوں کو جو کارتوس تقسیم کئے ہیں ان پر سور اور گائے کی چربی کے خول چڑھا دیئے ہیں اور چونکہ ان کارتوسوں کو بندوق میں داخل کرنے سے پہلے ہر سپاہی کو دانتوں سے وہ خول نوچنا ہوتا ہے اس لئے ہندو اور مسلمان دونوں کا مذہب اس سے ناس ہو رہا ہے۔ اس افواہ سے کلکتہ کی دیسی فوج میں کچھ بےچینی کے آثار پیدا ہوئے مگر میجر نے ان کو فوراً دبا دیا۔ لیکن یہ افواہ دبی نہیں بلکہ کچھ ہی دنوں میں شمالی ہند کی سب چھاؤنیوں یعنی بارک پور، کانپور، لکھنؤ، انبالہ اور میرٹھ میں آگ کی طرح تیزی سے پھیل گئی اور ہر جگہ دیسی سپاہیوں نے اس پر احتجاجی مظاہرے کئے لیکن حکومت نے بجائے اس کے کہ سپاہیوں کی غلط فہمی کو دور کرتی انتہائی تشدد سے کام لینا شروع کیا۔ جس رجمنٹ نے یہ سوال اٹھایا حکومت نے وہ رجمنٹ ہی توڑ دی جس دیسی سپاہی نے احتجاج کیا اس کا کورٹ مارشل کردیا۔ اسی غیر مصلحت اندیش تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۹ مئی ۱۸۵۷ء

کو جب میرٹھ چھاؤنی کے بعض دیسی سپاہیوں کو کارتوسوں پر اعتراض کرنے کے جرم میں حکومت نے دس دس سال قید سخت کی سزا کا حکم سنایا تو فوج کے ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور اس نے کھلم کھلا حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔

اس ہنگامہ میں سپاہیوں کے ساتھ بڑی تعداد میں وہ عوام بھی شریک ہو گئے جن پر ہندوستان میں کمپنی نے عرصہ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ اور جو افلاس اور بے روزگاری کے ہاتھوں اپنی زندگی ہی سے تنگ آ چکے تھے۔ ان کی شمولیت نے سپاہیوں کی بغاوت کو انقلاب کا رنگ دے دیا۔ کامل تین مہینے تک خصوصیت کے ساتھ "قلب ہندوستان" اس انقلاب کے شعلوں میں پھنکتا رہا اور چن چن کر ان مسلم گھرانوں کا ایندھن بنایا گیا جنہیں شاہی وقتوں میں تھوڑی بہت نمود حاصل تھی۔ تین مہینے بعد انقلاب کا زور ٹوٹا، سکھوں اور گورکھوں کی مدد سے باغیوں کو دبانے میں بالآخر انگریزوں کو کامیابی ہوئی اور اس کامیابی کے ساتھ انقلاب کا ردعمل شروع ہوا۔ یہ ردعمل خود انقلاب سے زیادہ شدید تھا اس لئے کہ اس میں ایک فاتح کا جذبہ انتقام پوری شدت سے کام کر رہا تھا۔ جو انقلاب سے بچا وہ ردعمل کی نذر ہو گیا۔ لیکن تخصیص اس دفعہ بھی صرف "مسلمان" ہی کی تھی، البتہ اب کے عوام و خواص میں کوئی تمیز نہیں کی گئی جو زد پر آیا بلا امتیاز تہ تیغ کر دیا گیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انتقام کے جوش میں حکومت اسباب بغاوت کو بھلا بیٹھی تھی اور اس کے دماغ میں صرف یہ خیال باقی رہ گیا تھا کہ:۔

"ہندوؤں سے ہمیں کوئی ڈر نہیں ہے یہ مسلمان ہی ہیں جو ہمارے دشمن اور رقیب ہیں" اسی کے ساتھ سکھوں کے خلاف مسلمانوں کے جہاد کی داستان تازہ تھی اور اس جہاد کے سلسلہ میں مسلمانوں نے جس جوش اور جی داری کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی حکومت کے حافظہ میں محفوظ تھا، اس اعتبار سے گویا انگریزوں کا اگر کوئی حریف رہ سکتا تھا تو وہ مسلمان اور صرف "وہابی" "مسلمان"!

حکومت کے اس ایقان کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان کا ہر مسلمان "وہابی" اور ہر "وہابی" عام اس سے کہ وہ قصوروار ہو یا نہ ہو قابل دار نظر آنے لگا۔ ہزاروں بے گناہ مسلمان اس دارو گیر کا شکار ہوئے اور جو اس سے بچ رہے وہ خانماں برباد ہو گئے۔ خدا خدا کرکے رد عمل کا یہ ہنگامہ بھی ختم ہو گیا۔ انگریزوں کے انتقام کی پیاس بھی بجھ گئی۔ کمپنی کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اور حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے نظم و نسق کو سنبھالنے کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ لیکن مسلمان اب تک حکمران قوم کا مقہور رہا۔ اسقدر تباہی اور بربادی کے بعد بھی حکومت اس سے بدگمان تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ یہ "قوم" کبھی قعر مذلت سے باہر نکل سکے! سر آکلینڈ کالون لفٹنٹ گورنر صوبہ متحدہ اس امر کا کھلے طور سے اس طرح اعتراف کرتے ہیں:۔ "غدر فرد ہو جانے کے بعد مسلمانوں ہی سے سخت انتقام لیا گیا اور دونوں قوموں یعنی انگریزوں اور مسلمانوں میں مصالحت کی امید جاتی رہی"

اگرچہ خود ایسٹ انڈیا کمپنی بھی مسلمانوں سے بدگمان رہتی تھی اور اس کا رویہ بھی مسلمانوں کے خلاف تھا لیکن اس کے باوجود ۱۸۵۷ء تک اس نے مسلمانوں پر معاشی دروازے بند نہیں کئے تھے بلکہ :۔

> "کمپنی کی حکومت کے شروع میں سرکاری ٹیکسوں کی وصولی کا کام آمدنی کا بہت بڑا ذریعہ تھا اور یہ کام تقریباً اعلیٰ طبقہ کے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا۔ آمدنی کا دوسرا ذریعہ پولیس کی ملازمت تھی، اس کے افسر بھی مسلمان ہوتے تھے، آمدنی کا تیسرا ذریعہ عدالتیں تھیں ان پر بھی مسلمان چھائے ہوئے تھے"۔ ("مسلمانان ہند" از ڈاکٹر ہنٹر بحوالہ روشن مستقبل)

لیکن غدر کے بعد یہ صورت بھی نہیں رہی۔ مسلمانوں کے لئے حکومت میں ملازمت کے دروازے بالکل بند کر دئے گئے تھے اور سماجی زندگی میں بھی ان کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی۔ بقول ڈاکٹر ہنٹر:۔

"مسلمان اب اس قدر گر گئے ہیں کہ اگر وہ سرکاری ملازمت پانے کی قابلیت بھی حاصل کر لیتے ہیں تب بھی انہیں سرکاری اعلانات کے ذریعہ سے خاص احتیاط کے ساتھ ممنوع الملازمت کر دیا جاتا ہے۔ ان کی بے کسی کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا اور اعلیٰ حکام تو ان کے وجود کو تسلیم کرنا ہی اپنی کسر شان سمجھتے ہیں۔" (مسلمانان ہند صفحہ ۱۵۸ بحوالہ روشن مستقبل)

چنانچہ حکومت کے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ تھا کہ:۔

"۱۸۶۹ء میں کلکتہ میں مشکل ہی سے کوئی دفتر ایسا ملتا تھا جس میں چپراسی چٹھی رساں یا دفتری کے علاوہ بھی کسی مسلمان کے پاس کوئی اور عہدہ نظر آتا ہو" (مسلمانان ہند صفحہ ۱۵۸ بحوالہ روشن مستقبل)

برخلاف اس کے ہندو برادران وطن کے ساتھ حکومت کو پوری ہمدردی تھی اور ہر لائن میں وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھی۔ اپنی قومی اصلاح کا خیال تو مدت سے ان میں پیدا ہو گیا تھا اور سارے ہندوستان میں یہ کسی نہ کسی رنگ میں پایا جاتا ہی تھا، غدر سے کچھ عرصہ پہلے اس خیال نے ہندوستان کی مختلف سمتوں میں مستقل طور پر مذہبی اور سوشیل تحریکوں کی شکل اختیار کر لی تھی، بنگال میں ہندوستان کے اور مقامات کی نسبت روشن خیالی زیادہ تھی چنانچہ مدت تک یہی خطہ سارے ہندوستان کی رہنمائی بھی کرتا رہا۔ جب ایک مدت تک بنگالی ہندوؤں میں سیاسی اور سماجی بیداری پیدا کر چکا تو مذہبی اور سماجی اصلاح کے لئے "برہمو سماج" کے نام سے ایک مستقل تحریک شروع کر دی، اس تحریک کا مقصد بت پرستی کی مخالفت اور بری ہندوانی رسموں کی اصلاح قرار دیا گیا تھا۔ جن میں کمسنی کی شادی، اور بیوگی کی لعنت کو ہندو عورت پر سے دور کرنے کا بھی اہتمام تھا، لیکن مقصد وحید اس تحریک کا یہ تھا کہ ہندوؤں کو پھر پراچین تہذیب کی طرف لے جایا جائے اور وہ نقوش محو کر دئے جائیں جو مسلمانوں کے دور حکومت میں ان کی تہذیب اور معاشرت

پر منقسم ہو گئے تھے۔ برہمو سماج کے بعد "سادھارنہ سماج" کے نام سے ایک دوسری تحریک فروعات میں ایک ذرا سے اختلاف کے ساتھ اسی بنگال سے شروع ہوئی۔ اسکی دیکھا دیکھی پونا والوں نے "سپرارتھنا سماج" قائم کر ڈالا جس میں علانیہ مسلمانوں کی تحقیر کی جاتی تھی۔ پونا کے بعد پنجاب کا نمبر آیا یہاں "آریہ سماج" کے نام سے ایک سوسائٹی بنی جس نے پوری شدت سے مسلمانوں کے مذہب ان کے تمدن اور کلچر پر نہایت سخت اور مکروہ انداز میں حملے شروع کر دئے جس کے باعث ہندوں اور مسلمانوں دونوں میں اشتعال پیدا ہونے لگا اور دونوں قوموں کی رائیں رفتہ رفتہ علیحدہ ہوتی گئیں۔

"آریہ سماج" کے بعد جنوبی ہند میں "تھیاسوفیکل سوسائٹی" قائم ہوئی جسکا مقصد قدیم ہندو فلاسفی اور ویدک تعلیمات کا پرچار تھا، اس تحریک نے آریہ سماجی تحریک سے مل کر پڑھے لکھے ہندوؤں تک کے زاویہ نظر بدل ڈالے۔ اور ایک ایسا "آئڈیل ہندوستان" ان کے دماغوں میں بسا دیا جہاں ہندوؤں کے سوا اور کسی دوسری قوم کی گنجائش نہ تھی اور سب سے آخر میں رام کرشن مشن عالم وجود میں آیا جس نے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر ہندو "در تصوف" اور ہندو کلچر کا پرچار اپنا مسلک بنایا۔

یہ ساری تحریکیں جیسا کہ ان کے مقاصد سے ظاہر ہو سکتا ہے صرف ہندوں کی اصلاح اور تنظیم کے لئے عالم وجود میں آئی تھیں اور غرض مشترک ان سب کی یہ تھی نو سو برس کی یکجائی کے باعث ہندوستان کی تہذیب و زبان، اور تمدن و معاشرت پر جو اسلامی اثرات قائم ہو گئے ہیں انہیں اس صفائی سے دور کر دیا جائے کہ اس عہد کی یاد بھی ہندوؤں کے حافظہ سے محو ہو جائے۔

مسلمانوں کی قسمت پر گویا مہر لگ گئی، ہندوستان کے انگریز اور ہندو دونوں ان کے وجود ہی کو مٹا دینے پر متفق ہو گئے۔ ایک نے مسلمانوں کی دنیاوی طاقت کو کچلا اور دوسرے نے ان کی سماجی زندگی اور سوشیل وقار کو ختم کر دینے کا تہیہ کر لیا۔ ان دو طرفہ

حملوں کا مقابلہ مسلمانوں کی طاقت سے باہر ہوا جاتا تھا خصوصًا اس لئے کہ خود مسلمان بھی ایک مرکز پہ متحد نہیں تھے بلکہ مذہبی اور سیاسی حیثیت سے پارہ پارہ ہو رہے تھے۔

اس وقت سب سے بڑا سوال مسلمانوں کے آگے روٹی کا تھا اور روٹی کا انگریزوں اور ہندوں نے حصار کر رکھا تھا جس تک ایک مسلمان کا محض "مسلمان" ہونے کی وجہ سے گذر نہ ہو سکتا تھا۔ مسٹر بیلی لکھنؤ کے رزیڈنٹ جو بعد کو حکومت ہند کے سکرٹری ہو گئے تھے اپنی ایک رپورٹ میں لکھتے ہیں :۔

"تعلیم یافتہ مسلمان اپنی پرانی قسم کی تربیت پر بھروسہ رکھنے کے باوجود اپنے کو حکومت کے عہدوں اور منافعوں سے جن پر اب تک وہ قابض تھا محروم پاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تمام نفع کے کام ہندوں کے ہاتھوں میں چلے گئے، اچھے تعلیم یافتہ لوگوں کے دل بے چینی سے لبریز ہو گئے ہیں یہ احساس اس خیال پہ مبنی نہ بھی ہو کہ ان لوگوں کو ان کے مذہب کی وجہ سے ستایا جا رہا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے مذہب کی وجہ سے ان کے ساتھ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے"

ایک تاریک اور بھیانک رات میں ایک شدید طوفانی سمندر کا تصور کیجے جس کی پُرشور موجوں میں ایک کشتی انتہائی بے بسی کے ساتھ ہچکولے کھا رہی ہو، اس عالم میں کہ منزل مقصود کوئی متعین نہ ہو، راستہ سوجھتا نہ ہو، اور ناخدا کوئی نظر نہ آتا ہو ا —— بالکل یہی کیفیت غدر بعد مسلمانوں کی تھی، نہ ان کی کوئی منزل مقصود تھی نہ ان کا کوئی رہنما تھا، اپنی جہالت اور زوال کی بھیانک تاریکی ان کے چاروں طرف چھا رہی تھی اور مخالفت کے طوفان میں ان کی کشتی حیات برابر ہچکولے کھا رہی تھی، اور ہر ہچکولے پر یہ گمان ہوتا تھا کہ بس اب ڈوبی ! اس عالم یاس اور ناامیدی میں ایک مرد خدا آگے بڑھ کر مسلمانوں کی قومی کشتی کا "سکان" سنبھالتا ہے، ساتھی غل مچاتے ہیں، طوفان کی شدت بڑھ جاتی ہے،

بجلی کی چمک اور کڑک سے قیامت صغریٰ کا دھوکا ہونے لگتا ہے لیکن وہ اللہ کا بندہ اس شور و غوغا سے قطعی بے پروا کشتی کا رُخ ایک خاص سمت کو پھیر دیتا ہے اور حوادث گردوپیش سے بے نیاز ہوکر نہایت استقلال کے ساتھ، بغض اعناد کے طوفانوں کو کچلتا، رشک و حسد کی پُرشور موجوں کو روندتا، اختلافات کی مہیب چٹانوں سے دامن بچاتا، اور ادبار و جہالت کی تاریکی کا سینہ چیرتا ہوا، قومی کشتی کو آگے نکالے لئے چلا جاتا تھا۔ تاآنکہ دُور افق پر روشنی کی ہلکی سی کرن نظر آنے لگتی ہے اور مسلمان اپنی روح میں نئی تازگی اور اپنے آپ میں زندگی کی نئی ترنگ محسوس کرنے لگتے ہیں ——— غالباً یہاں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مسلمانوں کی قومی کشتی کا ناخدا مسلمانوں کا پہلا رہنما "سید احمد خاں" تھا اور قوم کیلئے جو منزل مقصود اس نے متعین کی تھی وہ "قومی تعلیم" تھی!

سید احمد خاں نے مسلمانوں کی پستی اور ذلت کے اسباب کا بالکل ٹھیک اندازہ لگایا اور اس کا علاج بھی نہایت صحیح تجویز کیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اس بدگمانی کو دُور کرنے پر اپنا سارا زور خرچ کر ڈالا جو مسلمانوں کی طرف سے حکومت کے دل میں بیٹھ گئی تھی، حکومت کو اپنی غلطی سمجھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن سید احمد خاں نے اپنی جرأت اور ہوشمندی سے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ اپنے دلائل کے زور سے انگریزوں کی حاکمانہ کمزوریوں پر ایسے فاضلانہ انداز میں محاکمہ کیا کہ مسلمانوں کے خلاف جو شکوک و شبہات حکمران قوم کے دل میں بیٹھ گئے تھے۔ اور جن کے باعث آئے دن حکومت غلط فہمیوں کا شکار رہتی تھی، وہ ایک ایک کرکے دور ہونے لگے اور حکومت برطانیہ کو اپنی ہندوستانی پالیسی پر نظرثانی کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

اس کے بعد سید احمد خاں نے ہندوؤں کی سرد مہری کو دور کرنے کی کوشش کی اپنی سرگرمیوں کے ابتدائی دور میں وہ ہمیشہ ہندو مسلمانوں میں صفائی پر زور دیا کرتے تھے،

بارہا انہوں نے اپنی تقریروں میں ہندوستان کو دلہن سے اور ہندو مسلمانوں کو اس کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی اور اس بات کی تمنا کی کہ ہندوستان کی یہ دونوں قومیں متفق ہو کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوں اور حکمراں قوم سے اپنے سیاسی اور سماجی حقوق کا مطالبہ کریں۔ لیکن سید احمد خاں کی یہ کوشش کامیاب اور یہ تمنا بار آور نہ ہوئی اسلئے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے انگریز ہندوؤں کی طرف متوجہ تھے اور حکومت ہند کے ہر شعبہ میں انہوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دے رکھی تھی، اور غدر کے بعد تو ان دونوں کے آپس کے تعلقات میں اور زیادہ منافرت پیدا ہو گئی تھی، جس کے باعث ہندوؤں میں مسلمانوں پر اپنی برتری کا احساس پیدا ہو گیا تھا اور وہ حکومت برطانیہ کے بعد اپنے آپ ہی کو ہندوستان کا حاکم سمجھنے لگے تھے۔ ظاہر ہے اس خیال کے قائم ہونے کے بعد سید احمد خاں کی وہ مخلصانہ اور "برادرانہ" تجویز کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتی تھی جس کے معنے یہ تھے کہ ہندو اپنے اس بلند مرتبہ سے نیچے اُتر آئیں جہاں کمپنی نے اور اس کے بعد حکومت برطانیہ کی مصلحت اندیشیوں نے ان کو پہونچا دیا تھا۔ اور مسلمانوں کو ساتھ لیکر نئے سرے سے سارے ہندوستان کے لئے ان سیاسی اور سماجی حقوق کے لئے جدوجہد کریں جن کی مبادیات وہ اپنی "ذات" کی حد تک پہلے ہی طے کر چکے تھے!

تیسری تجویز سید احمد خاں کی یہ تھی کہ مسلمانوں کو اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم جدید سے آراستہ کر کے مستقبل کے ہندوستان میں اپنی شایان شان جگہ بنا لینے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ یہ سید احمد خاں کی وہ زبردست تعمیری اسکیم تھی جس نے فی الحقیقت ہندوستانی مسلمانوں کی قسمت پلٹ دی اور برطانوی سیاست کا رخ پھیر کر رکھ دیا۔

سید احمد خاں کی ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ ہندوستان اور انگلستان میں چند منصف مزاج اور معاملہ فہم انگریز مدبر مسلمانوں کی حمایت پر آمادہ ہو گئے اور انہوں نے نہ صرف یہ کہ حکومت کی اس غلط پالیسی کا علانیہ اعتراف کر لیا جو اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق

اختیار کر رکھی تھی بلکہ طرح طرح سے حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ وہ اس غلطی کی تلافی کرے اور بہت جلد اپنی ہندوستانی پالیسی میں بنیادی تبدیلی کر دے۔ اس معاملہ میں جب ہر طرف سے پیہم زور پڑا اور حکومت بھی اپنی کمزوریوں سے اچھی طرح آگاہ ہو گئی تو مسلمانوں کے متعلق اس کی معینہ پالیسی میں تبدیلی کے آثار پیدا ہونے لگے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کی مناسب اور معقول تعلیم کا مسئلہ حکومت کے سامنے آیا حکومت نے اس کے حل کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا جگہ جگہ مسلمانوں کے لئے عربی، فارسی اور اردو کی کلاسیں کھولیں اسلامی مدرسوں کو گرانٹ اور ہونہار مسلمانوں بچوں کو وظائف دیئے۔ مسلمانوں کی سماجی ترقی سے بھی ہمدردی کا اظہار کیا اور حکومت میں ملازمت کے دروازے بھی جواب تک ان پر بند تھے کھول دئے لیکن مسلمان من حیث الجماعت فی الفور اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے اس لئے کہ ایک مدت تک صحیح تعلیم سے محروم رہنے کے باعث وہ حکومت کی ذمہ دار آسامیوں کو سنبھالنے کے قابل نہ رہے تھے اور برادر وطن نے برسوں پیشتر سے اس شعبہ میں اپنے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔

اس نوبت پر ایک اور ناگوار صورت پیش آئی ہندو برادران وطن مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کی پالیسی میں اس تبدیلی سے خوش نہیں ہوئے۔ بلکہ انہیں یہ غلط فہمی ہو گئی کہ مسلمانوں کے ابھر آنے سے ان کی اپنی سیاسی اہمیت جو غلط یا صحیح طور پر وہ ملک میں حاصل کر چکے تھے۔ ختم ہو جائے گی اور خود حکومت کے نزدیک بھی ان کا وقار باقی نہیں رہے گا۔ بہ الفاظ دیگر ہندو دماغوں میں یہ خیال جم گیا تھا کہ انکا اقتدار مسلمانوں کے پست اور ذلیل رہنے ہی میں قائم رہ سکتا ہے۔ ادہر مسلمان ابھرے اور ادہر ان کے اقتدار پر ضرب لگی۔ یہ خیال ایسا بے حقیقت نہیں ہو سکتا تھا کہ ہندو بھائی مسلمانوں کے ابھرنے کو برداشت کر جاتے۔ چنانچہ حکومت کی نظریں پھرتے ہی ہندوؤں کے ضبط کا پیمانہ چھلکا اور اس کے ساتھ وہ معمولی احتیاط بھی برطرف ہو گئی جو اس وقت تک علانیہ مسلمانوں کے مقابل ہونے

میں برتی جاتی تھی۔ ہندوؤں کی اس روش کو انگریزوں نے بھی محسوس کیا اور مسلمانوں نے بھی۔ مسلمانوں نے برادران وطن کے اس طرز عمل پر جو رائے قائم کی سو کی انگریزوں نے ہندوؤں کے اس رویہ کو جس نظر سے دیکھا اس کا اندازہ مسٹر جیمس او کینیلی کے اس مضمون سے ہوتا ہے جو انہوں نے سنہ ۱۸۷۱ء میں کلکتہ ریویو میں لکھا تھا اس مضمون میں وہ فرماتے ہیں :-

"اب جبکہ انگریزوں اور مسلمانوں کے اخبار حکومت پر زور دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کی پست حالت سے ابھاریں اور انہیں ملک کی حکومت میں اپنا مناسب حصہ حاصل کرنے میں مدد دیں تو ہندوؤں کی جماعت سامنے آ کر پبلک کو یاد دلاتی ہے کہ مسلمانوں کی ایک مخصوص جماعت غیر وفادار لوگوں کی ہے جسے تمام مسلمانوں کی ہمدردی حاصل ہے چنانچہ ۴ر اگست سنہ ۱۸۷۱ء کے "ہندو پیٹریٹ" میں ایک مضمون شائع ہوا ہے (جسکا خلاصہ یہ ہے)

"اس دور حکومت میں جسکو رعایا پرور اور درخشاں تو کہہ لیجے لیکن زیادہ ہوشمند اور فرزانہ نہیں کہہ سکتے۔ "فرائضی" اور وہابیوں کے باغیانہ عنصر کا ہونا یقینی ہے۔ ان فرقوں کا تمام دیسی ریاستوں میں اثر ہے انکی تنظیم "جیسیوٹ" یعنی عیسائیوں کے یعقوبی فرقے سے ملتی جلتی ہے۔ وہابی یوں تو کچہریوں میں کلرکیوں پر اور محرریوں پر کام کرتے ہیں۔ تجارتی خرید و فروخت میں مشغول ہیں اور ملک کی آبادی میں خاموشی کے ساتھ ملتے جلتے رہتے ہیں لیکن اپنے اصل مذہبی رنگ کو یا اپنے مقاصد کو کبھی نہیں بھولتے بغیر نمائش کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرتے ہیں۔ ان میں اتحاد عمل ہے۔ مذہب کو ابتدائی سادگی پر لا کر اسلام کا سیاسی تفوق قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اندیشہ ہے کہ اپنی بربریت سے یہ کسی وقت موجودہ

تہذیب کو فنا کر دیں حکومت کو چاہئے کہ ان کی تحقیقات کرے ان کا اثر دوسرے مسلمانوں پر بھی ہے" (روشن مستقبل)

اس مضمون میں جس انتہا سے گذری ہوئی گندی ذہنیت کا مظاہرہ کیا گیا ہے اور جس قدر مکروہ انداز میں حکومت کو پھر مسلمانوں سے بدگمان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس سے ہندو بھائیوں کے دل کا حال ظاہر ہوتا ہے۔ اس مضمون میں مسلمانوں پر جو الزامات لگائے گئے ہیں اگر ان کا جواب ایک جوشیلا اور متعصب مسلمان دیتا تو وہ غالباً یہ لکھتا:۔

"اگر مسلمان فی الحقیقت ایسے ہی باغی عنصر پر مشتمل ہوتے جیسا کہ اس مضمون میں ظاہر کیا گیا ہے اور ان کی بربریت کا یہی حال ہوتا جس کا نام لیکر انگریزوں کو ڈرایا گیا ہے تو ہندوستان میں مسلمانوں کے نوسو برس کے حاکمانہ اقتدار کے بعد ہندوستان کی پراچین تہذیب شاید فسانہ ہو جاتی اور ہندو اتنی مدت تک بربریت کے زیر مشق آکر ایسا غائب ہوتا کہ ڈھونڈے سے بھی کوئی نہ ملتا!"

لیکن مسٹر جیمس اوکینیلی نے اس مضمون پر بڑی رواداری اور معقولیت سے نظر کی ہے وہ ان الزامات کی پُر زور انداز میں تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مسلمانوں کی بے اطمنانی بے بنیاد ہے سالہا سال سے مسلمانوں کو نظر انداز کیا جا رہا انہیں ایسی رعایا سمجھا جاتا ہے جنکی اطاعت بہت مشتبہ ہے۔ ان کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی جا رہی ہے حتیٰ کہ ان کے اوقاف کی آمدنیوں کو جو اسلامیہ کالجوں کے قیام کے لئے تھیں دوسرے کاموں میں صرف کیا جاتا ہے۔

ہمیں امید ہے کہ موجودہ غفلت کے بعد ایک عاقلانہ اور فیاضانہ حکمت عملی اختیار کی جائے گی"

مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا یہ طرز عمل بے وجہ نہیں تھا، اتنی مدت تک انگریزوں اور حکومت برطانیہ کے ساتھ کام کرتے رہنے کے بعد وہ انگریزوں کا اصول حکومت بھی اچھی طرح سمجھ گئے تھے اور اپنی قدر بھی پہچان گئے تھے۔ اور چونکہ ان کی قومی تنظیم کا کام بھی ایک مدت سے جاری تھا اس لئے انہیں ہندوستان میں اپنی سیاسی طاقت کا بھی اندازہ قائم ہو چلا تھا، اس نوبت پر وہ مسلمانوں کی طرف نہیں جھک سکتے تھے کیونکہ اس کے معنی یہ ہوتے کہ وہ خود اپنے اقتدار میں مسلمانوں کو شریک کر لیں۔ بلکہ وہ اسی خیال کے ماتحت مسلمانوں کو ابھرنے دینا بھی نہیں چاہتے تھے کیونکہ جانتے تھے کہ اس میں سراسر ہندوؤں ہی کا نقصان ہوگا اور یہی وجہ تھی کہ جسوقت انگریز نے مسلمانوں کے متعلق اپنی پالیسی میں تبدیلی کی تو انہیں سخت ناگوار ہوا اور ان کا متعصب اور جوشیلا طبقہ علانیہ مسلمانوں کے مقابل آ گیا۔

ہندوؤں کی مذہبی اور سوشیل تحریکوں کا حال آپ پچھلے اوراق میں پڑھ ہی چکے ہیں ان تحریکوں کے ساتھ مدت ہوئی کہ باقاعدہ سیاسی انجمنیں بھی جگہ جگہ قائم ہو چکی تھیں اور ان میں ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کی بحث چھڑ چکی تھی، سب سے پہلی سیاسی انجمن ۱۸۵۱ء میں "برٹش انڈین ایسوسی ایشن" کے نام سے بنگال میں قائم ہوئی اس کے بعد بمبئی میں "بمبئی ایسوسی ایشن" کے نام سے ایک سیاسی انجمن بنی دادا بھائی نوروجی اس کے بانیوں میں تھے۔ بمبئی کے بعد مہاراشٹرا میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور "سروجانک سبھا" کے نام سے پونا میں ایک سیاسی جماعت عالم وجود میں آئی۔ اور سب سے آخر میں مدراس میں "مہاجن سبھا" قائم ہوئی۔ ۱۸۷۶ء میں بنگال میں ایک اور سیاسی انجمن بنی "انڈین ایسوسی ایشن" یہ بنگال کی پہلی سیاسی انجمن سے مختلف اور بہت زیادہ ترقی یافتہ لائنوں پر قائم کی گئی تھی اور اس کے بانی سر سریندر ناتھ بنرجی تھے۔ اس انجمن کے قیام کے بعد ہندو بھائیوں کے حوصلے بڑھے اور

انہوں نے بے تکلف حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینیاں کرنی شروع کردیں۔

یہ لارڈ رپن کا عہد حکومت تھا، اس عہد میں ہندوستانی طرز حکومت میں بہت سی اصلاحیں ہوئیں۔ ہندوستانی اخبارات پر سے پابندیاں اٹھائی گئیں اور سیاسی جماعتوں کو بطور مشورہ ہندوستان کے اصول حکومت پر نکتہ چینیاں کرنے کی بھی آزادی دیدی گئی اسی آزادی سے بنگال کی "انڈین ایسوسی ایشن" نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس ایسوسی ایشن کے روح رواں سر سریندر ناتھ بنرجی نے جو حکومت میں انڈین سول سروس کے ممبر بھی تھے ہندوستان کے مختلف صوبوں کا دورہ کرکے رائے عامہ کو بیدار کرنا شروع کردیا۔ اسی زمانہ میں حکومت ہند نے ایک بل پاس کروایا جس کا مقصد مجسٹریٹوں پر سے وہ بندشیں اٹھا لینا تھا جو ان پر یورپین اور امریکن مجرموں کی سماعت کے متعلق عاید تھیں اس بل کے پاس ہوتے ہی ہندوستان کے انگلو انڈین طبقہ کی طرف سے اس بل کو ناکام بنانے کی منظم کوشش ہوئی اور وائسرائے ہند اور انگلو انڈین طبقہ کے تعلقات خراب ہوگئے۔ دوسری طرف ہندوستانی، انگلو انڈین طبقہ کی اس روش سے بہت چیں بہ جبیں ہوئے اس لئے کہ اس بل کو ناکام بنانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا کہ ہندوستان میں رنگ و نسل کا امتیاز بدستور قائم رکھا جائے۔

اس خیال کے آتے ہی بنگال، مدراس اور بمبئی کی سیاسی انجمنوں میں حرکت پیدا ہوئی اور ہندوستان کے جوشیلے طبقہ میں اشتعال پیدا ہوگیا جس سے اندیشہ ہوا کہ کہیں ملک کی سیاسی فضا پھر مکدر نہ ہوجائے۔ یہ صورت حال کافی خطرناک تھی جسکا فی الفور انسداد کرنا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ ہندوؤں کے سمجھ دار دماغوں اور ہندوستان کے انگریز دوستوں نے اس قسم کی اشتعال انگیزیوں کو ملک میں پھیلنے سے روکنے کی یہ تدبیر سوچی کہ ہر صوبہ میں انفرادی طور پر سیاسی سرگرمیوں کے جاری رکھنے کے

بجائے اسے مرکزی حیثیت دیدیں اور ایک آل انڈیا سیاسی جماعت کی تشکیل کرکے اُسے ذمہ داری کے ساتھ حکومت میں ہندوستانیوں کی نمائندگی کا حق عطا کردیں۔ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کا سہرا مسٹر اے او ہیوم کے سر ہے جو انڈین سول سروس کے آدمی تھے اور پنشن لیکر ہندوستان ہی میں رہ پڑے تھے، انہوں نے ہندوستان کے سیاسی اداروں اور ذمہ دار افراد کے نام ایک گشتی خط بھیجا اور انہیں اس پر آمادہ کیا کہ وہ سب ایک مرکز پر جمع ہو کر یہ سوچیں کہ ہندوستان کی ارتقائی منزل کیا ہو سکتی ہے اور اسی کے ساتھ برطانیہ کے طرز حکومت پر بھی بحث کرکے یہ بتائیں کہ کس شعبے میں وہ ہندوستانی نقطہ نظر کو مطمئن کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس تجویز کو ہندوستانیوں کے آگے پیش کرنے سے پہلے مسٹر ہیوم نے اس کو اسوقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن کے آگے رکھا تھا اور جب وائسرائے نے اس سے اتفاق کر لیا تو اس کے بعد مسٹر ہیوم نے اپنا گشتی خط ہندوستان کے ذمہ دار افراد کے نام بھیجا تھا۔ لارڈ ڈفرن نے اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے یہ کہا تھا:۔

"اس ملک میں ایسے لوگوں کی کوئی جماعت نہیں ہے جو مثل انگلستان کے ملک معظم کی حکومت کی "اپوزیشن پارٹی" کی طرح کام کرے۔ انگریزوں کو چونکہ یہ علم نہیں ہوتا کہ ہندوستانیوں میں ان کی نسبت اور ان کی پالیسی کی نسبت کیا خیالات ہیں۔ اس لئے حاکم اور محکوم دونوں کے لئے یہ مفید معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے سیاستداں اصحاب سالانہ جمع ہوکر گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ اس کا نظام کن امور میں ناقص ہے اور اس کو کس طرح بہتر بنایا جا سکتا ہے۔"

مسٹر ہیوم کے گشتی خط اور لارڈ ڈفرن کے اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ہندوستان میں ایک "اپوزیشن پارٹی" بنانے کی کوشش کی تھی، تاکہ حکومت میں

ہندوستانیوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کا بھی انتظام ہو جائے۔ حاکم و محکوم کے درمیان غلط فہمیوں کا امکان بھی باقی نہ رہے اور آپس کے تعلقات بھی استوار ہو جائیں۔ چنانچہ اسی بنیادی خیال کے مطابق ۱۸۸۵ء ۲۷ر دسمبر کو آل انڈیا یونین کے نام سے (جو بعد میں آل انڈیا کانگریس کہلائی) بمبئی میں ایک مرکزی جماعت کی تشکیل ہو گئی۔

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر ہیوم اور لارڈ ڈفرن نے جس خیال کے ماتحت ہندوستان میں ایک مرکزی سیاسی جماعت بنانے میں مدد دی تھی، ٹھیک وہی خیال ان ہندوستانی افراد کا نہیں تھا جو اس مرکزی جماعت کے بانی ہوئے ہیں۔ یہ لوگ کوئی "اپوزیشن پارٹی" نہیں بنانی چاہتے تھے بلکہ ایک خالص سیاسی مرکزی "قومی" ادارہ بنانا چاہتے تھے، اور قومی بھی انہی محدود معنوں میں جن معنوں میں برہمو سماج، پرارتھنا سماج، یا آریہ سماج کی جماعتیں بنائی گئی تھیں، چنانچہ جب ایک آل انڈیا جماعت کی تشکیل ہو چکی تو اُسے "یونین" کے بجائے "کانگریس" کا نام دیکر سارا سوشیل پروگرام وہی قبول کر لیا گیا جو برہمو سماج اور آریہ سماج یا ان جیسی اور فرقہ دار جماعتوں کا تھا اور جس سے ظاہر ہے کہ غیر ہندوؤں کو نہ دلچسپی ہو سکتی تھی اور نہ تعلق یہی صورت اس وقت تک قائم ہے اور آج بھی کانگریس کا سوشیل پس منظر بالکل وہی ہے جو کسی ٹھیٹ اور خالص ہندو جماعت کا ہو سکتا ہے بلکہ ہندو مسلم مشترک تہذیب سے تعصب ابتدائی دور کی بہ نسبت زیادہ شدید ہو گیا ہے اور اس کے مقابلہ میں پراچین تہذیب، قدیم ہندو تمدن، خالص ہندو معاشرت ہندو زبان اور ہندو روایات سے گرویدگی بڑھ گئی ہے۔ ڈاکٹر پٹابھائی سیتا رامیہ جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذمہ دار رکن اور ۱۹۳۹ء میں کانگریس کی صدارت کے امیدوار بھی تھے اپنی کتاب "تاریخ کانگریس" میں برہمو سماج اور آریہ سماج وغیرہ جیسی سخت فرقہ وار تحریکوں کی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :—

"القصہ یہ تمام تحریکیں ہندوستانی نیشنلزم کو ایک رشتہ میں پرونے کے لئے مختلف لڑیاں تھیں۔ جو پرانے بوسیدہ خیالات کو ذرا صاف کرکے قومیت اور حب الوطنی کی طرف لانے کے لئے نہایت اہم اور ضروری تھیں جسکو بالآخر انتہائی عروج اور پایۂ تکمیل پر پہونچانے کا کام انڈین نیشنل کانگرس کے سپرد ہوا۔" (صفحہ ۲۲)

اور مسٹر آچاریہ کرپلانی جو کامل دس برس سے آل انڈیا کانگرس کے جنرل سکرٹری اور نہایت ذمہ دار رکن چلے آتے ہیں اس سے بھی زیادہ صفائی کے ساتھ اگست ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک بیان میں کہتے ہیں:۔

"کانگرس صرف سیاسی جماعت نہیں ہے سیاست کی طرح وہ معاشرت کو بھی نئی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتی ہے جو لوگ اس کے معاشرتی اصول نہ مانیں ان کو کانگرس میں نہ داخل ہونا چاہیئے۔ کانگرسی اسکیموں کا قلم کسی اور فلسفہ میں نہیں لگایا جاسکتا۔ یہ فلسفہ زندگی دنیا کے کسی اور فلسفہ زندگی کے ماتحت نہیں بنایا جاسکتا۔ ہر کانگرسی کو گاندھی جی کا فلسفہ ماننا اور تسلیم کرنا ضروری ہے۔

اب کانگرس صرف ایک ایسی سیاسی جماعت نہیں جو ملک کو پردیسی اقتدار سے آزاد کرانا چاہتی ہے بلکہ یہ ہماری معاشرت کی موجودہ مشیت کو بھی بالکل بدل ڈالنا چاہتی ہے اور اس کی بنیاد بالکل نئے فلسفہ پر رکھنا چاہتی ہے۔ جب تک گاندھی جی کا اثر کانگرس پر غالب نہیں تھا اس وقت تک کانگرسی لیڈروں نے یہ طے کیا تھا کہ کانگرس کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ معاشرتی اصلاح کے کاموں میں دخل دے وہ اسے بالکل سیاسی جماعت رکھنا چاہتے تھے لیکن گاندھی جی نے آکر اس اصول کو توڑ دیا

انہوں نے پرانے ڈاکٹروں کی تشخیص کو غلط قرار دیکر یہ بتلایا کہ ہماری سیاسی غلامی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے ہم اپنی اخلاقی، روحانی اور معاشرتی زندگی سے جدا کر سکیں اسلئے ہماری سیاسی جدوجہد کو معاشرتی، اخلاقی اور روحانی جدوجہد کے ساتھ وابستہ کرنے کی ضرورت ہے۔"

ان دو ذمہ دار اور مستند بیانوں کے بعد یہ ثابت کرنے کے لئے غالباً کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں ہے کہ آل انڈیا کانگریس جس جماعت کا نام ہے وہ آریہ سماج وغیرہ قسم کی تحریکوں کی ترقی یافتہ صورت ہے اور اس کی بنیاد یکسر ہندو فلاسفی اور قدیم ہندو روایات پر رکھی گئی ہے۔

٭٭٭

جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے ابتداءً اس مرکزی جماعت کو حکومت کی ہمدردی حاصل تھی بلکہ خود حکومت کے اشارے سے یہ عالم وجود میں آئی تھی، لیکن برس دو ہی برس کے عرصہ میں جب اس کے بانیوں اور رہنماؤں کی صحیح ذہنیت کا حکومت کو علم ہوا تو اسکی ہمدردیاں بھی اس جماعت سے ختم ہو گئیں سب سے پہلے اودھ کے لفٹننٹ گورنر سر آکلینڈ کالون نے اس کو باغیانہ تحریک قرار دی دوسرے صوبوں میں اس کے خلاف اگرچہ حکومت نے کوئی شدید قدم نہیں اٹھایا لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس نئی جماعت سے انگریزوں کو کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی بلکہ حکومت اب اُسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔

اس جماعت کی تشکیل اگرچہ بمبئی میں عمل میں آئی تھی اور دوسرے صوبوں کے ڈیلیگیٹ بھی اس اجتماع میں شامل تھے لیکن غالب اکثریت بنگال کے ہندوؤں کی تھی اور وہی دراصل اس جماعت کے روح رواں سمجھے جاتے تھے مسلمان اس کے بانیوں میں کوئی نہ تھا البتہ کانگریس کے قیام کے بعد اس کے ابتدائی دور کے اجلاسوں میں عباس طیب جی کا نام ضرور آتا ہے اور ان کے علاوہ بھی چند مسلمان اس جماعت میں شامل

نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ انفرادی معاملہ تھا، مسلمانوں نے من حیث القوم اس جماعت سے کبھی کوئی تعلق نہ رکھا۔ ہو سکتا تھا کہ مسلمان بہ حیثیت جماعت کے پوری دلچسپی کے ساتھ اس مرکزی ادارے میں شامل ہو جاتے اس لئے کہ اس نئی جماعت نے سیاسی جد وجہد کو اپنا مسلک اور حکومت کی بندشوں کو ڈھیلا کرنا اپنا مقصد قرار دیا تھا اور مسلمانوں کے لئے فطرتاً اس سے زیادہ لبھانے والا کوئی اور خیال نہیں ہو سکتا تھا لیکن عین اس وقت جبکہ مسلمان کچھ متزلزل ہو چلے تھے سید احمد خاں نے پوری شدت سے کانگرس کی مخالفت شروع کر دی اور مسلمانوں کے رجحان کو بالکل ہی کانگرس کی طرف سے پھیر دیا۔

کانگرس کی مخالفت کے سید احمد خاں کے پاس تین وجوہ تھے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں صفائی باقی نہیں رہی تھی بلکہ حالات ایسے پیدا کئے جا رہے تھے کہ دونوں کے دل ایک دوسرے سے پھٹ جائیں۔ مثلاً ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب و معاشرت کو مٹانے کی ہندوؤں کی مذہبی اور سوشیل جماعتوں کی طرف سے تو کوششیں ہو ہی رہی تھیں۔ اسی دوران میں ہندوؤں کی طرف سے زبان کا مسئلہ اٹھا، اردو مدتوں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان چلی آتی تھی، اس لئے کہ انہی دونوں قوموں نے اپنی ضرورت کے لئے اُسے بنایا اور ہر خیال کے اظہار میں ہمیشہ اسی کو برتا لیکن اب ہندو اس زبان سے بیزار تھے۔ غالباً وہ ہندو مسلم اتحاد کی اس یادگار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، چنانچہ ہندوؤں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ہندی کو انکی قومی زبان قرار دیا جائے اور اردو کے بجائے ہندی زبان کو رائج کیا جائے۔

زبان کے ساتھ ساتھ ذبیحہ گاؤ کا مسئلہ اٹھا اور اس قدر ہنگامہ خیز انداز سے کہ مہاراشٹرا اور اودھ میں اس پر کئی جگہ اچھا خاصہ ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ حالانکہ ان مقامات پر گائیں ذبح کر کے مسلمانوں نے کوئی جدید روایت کی طرح نہیں ڈالی تھی اور نہ ہندوؤں کی دل آزاری ان کا مقصود تھا۔ بلکہ مدت سے یہ رسم بلا مزاحمت ہوتی

چلی آئی تھی، اور مسلمانوں نے بلا کسی اضافہ یا جدت کے اسی کو برقرار رکھا تھا ہندو بھائیوں کی دل آزاری کا اندیشہ اس قدیم رسم کی تکمیل کے وقت ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آیا تھا۔ ان پے در پے واقعات کا مسلمانوں کے دل پر اثر ہونا لازمی تھا اور ہوا، بلکہ اس اثر میں ایک ناگوار تلخی اس خیال سے اور پیدا ہو گئی کہ ہندوؤں کے ذی فہم اور ذمہ دار افراد نے ہندو عوام کی ان اشتعال انگیزیوں پر نہ صرف احتساب نہیں کیا بلکہ انہوں نے ان دونوں قضیوں میں ان کی ہم نوائی کی۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ جب تک ذمہ دار ہندو افراد کی یہ ذہنیت قائم ہے اسوقت تک دونوں قوموں میں صفائی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی اور جب تک پوری طرح صفائی نہ ہو جائے اسوقت تک یہ دونوں قومیں متحد ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتیں۔

دوسری وجہ کانگرس کی مخالفت کی یہ تھی کہ مسلمان تعلیمی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے برادران وطن سے بہت پیچھے تھے اور ان میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ سیاسی مسائل میں ہندو بھائیوں کا "زاویہ نگاہ" سمجھتے اور اسے خود بھی اختیار کر لیتے۔ اس ناسمجھی کے ساتھ اگر مسلمان کانگرس میں جاتے بھی تو کانگرس کے مقصد کو کوئی فائدہ نہ پہونچتا۔ البتہ وہ اپنا نقصان کر لیتے۔ ——— اتحاد یا اشتراک عمل چونکہ پست و بلند میں نہیں ہوا کرتا اس لئے جب تک مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی سطح بلند نہ ہو جاتی اسوقت تک صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک عمل ممکن نہ تھا اور جب تک خیال و عمل میں یکسانیت نہ پیدا ہو مسلمان ہندوؤں کے ساتھ ملکر کوئی مفید کام نہیں کر سکتے تھے۔ اسی خیال کے ماتحت سید احمد خاں کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمان اسوقت سیاست سے علحدہ رہکر اپنے آپ کو تعلیم جدید سے آراستہ کر لیں تاکہ وہ کمی جو مسلمانوں میں برادران وطن کے مقابلہ میں محسوس ہو رہی ہے پوری ہو جائے اور پھر مستقبل کے ہندوستان کی تعمیر میں یہ دونوں قومیں ایک دوسرے کا اچھی طرح ہاتھ بٹا سکیں۔

تیسری وجہ کانگرس کی مخالفت کی سید احمد خاں کے پاس یہ تھی کہ کانگرس اگرچہ حکومت کی اپنی مرضی سے گورنمنٹ " اپوزیشن پارٹی" کی حیثیت سے قائم ہوئی تھی لیکن اس کی بے محابا تحریکوں کے باعث خود حکومت ہی اس کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگی ہے ایسی صورت میں اگر مسلمان جو مدتوں حکومت کی بدگمانی کا شکار رہے ہیں اس میں شریک ہوئے تو نہ صرف کانگرس سے حکومت کی بدگمانیاں بڑھ جائینگی اور ان بدگمانیوں کے ساتھ نئے اندیشے پیدا ہو جائیں گے بلکہ مسلمان جو انتہائی تباہی و بربادی کے بعد ابھی اچھی طرح سنبھل بھی نہیں سکے ہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائیں گے۔

کانگرس کی مخالفت میں سید احمد خاں کے یہ دلائل اسقدر قوی اور وزنی تھے کہ مسلمان عوام کی توجہ کانگرس کی طرف سے ہٹ گئی اور مسلمانوں کو من حیث القوم اس مرکز سیاسی ادارے سے کوئی تعلق نہ رہا۔

لیکن یہ نہ سمجھئے کہ سید احمد خاں کے اس پند و نصیحت کے بعد مسلمان سیاست ہی سے کنارہ کش ہو گئے۔ کانگرس سے وہ بیشک علحدہ رہے مگر ملکی سیاست سے ان کی دلچسپیاں بدستور قائم رہیں بلکہ جوں جوں سیاسی بصیرت ان میں بڑھتی گئی، ان کی دلچسپیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

سید احمد خاں کی طرف سے کانگرس کی مخالفت کے بعد مسلم سیاسی حلقوں میں یہ سوال پوری سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث آگیا کہ :-

"مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرتبہ کیا ہے؟"

اس سوال کا حل سید احمد خاں اور ان کے پیروں کے نزدیک یہ تھا کہ "حکومت برطانیہ کو بدگماں کئے بغیر مستقبل کے ہندوستان میں مسلمان اپنی ایک مضبوط انفرادیت قائم کریں"، اور یہی نقطہ نظر اسوقت ہندوستان کے عام مسلمانوں کا بھی تھا۔ لیکن اسکے برخلاف ایک چھوٹا سا گروہ مسلمانوں کا سید احمد خاں کے اس نظریہ سے متفق نہ تھا۔ اسکے

نزدیک اس سوال کا بہترین حل یہ تھا کہ :-

"ہندوؤں کے ساتھ مل کر پہلے ہندوستان سے غیر ملکی اقتدار کا خاتمہ کریں اور اس کے بعد مستقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کا سیاسی مرتبہ متعین کریں"

یہ گروہ مولویوں کا تھا، اور اس نے اپنے اس نظریہ کو عوام مسلمانوں میں مقبول بنانے کے لئے مذہب کو آلہ کار بنایا تھا۔ چنانچہ اسی زمانہ میں جب سید احمد خاں مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے باز رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے اس گروہ نے ان کے سیاسی مسلک کے خلاف "فتوے" شائع کئے اور نہ صرف سید احمد خاں کے سیاسی مسلک کی مخالفت کی بلکہ ان کے مذہبی اور تعلیمی نظریوں کے خلاف بھی اس گروہ نے "جہاد" شروع کر دیا۔ اور انہیں (سید احمد خاں کو) کافر اور نیچری مشہور کر کے عام مسلمانوں کو ان کی ذات کے خلاف بھڑکانا اور ان کے تعلیمی اور سیاسی نظریوں سے بدگمان کرنا شروع کر دیا تھا۔

بہر حال اس گروہ کے ان غیر ذمہ دار اور اشتعال انگیز طرز عمل سے قطع نظر مسلمانوں میں ایک چھوٹی سی جماعت ایسی ضرور بن گئی جس نے اس کے سیاسی نظریہ کو سنجیدگی سے قبول کر لیا اور چونکہ اس نظریہ میں کافی وزن اور اثر بھی تھا اس لئے ہندوستان کی مسلم سیاست میں یہ دونوں نظریہ بطور بنیاد کے قبول کر لئے گئے بلکہ ان ہی پر بعد میں مسلم سیاست کی تعمیر شروع کر دی گئی ———— آئندہ اوراق میں مسلم سیاست کے انہی نظریوں پر تفصیل سے گفتگو کرنی مقصود ہے ✢

پہلا باب (۱)

مسلمانوں میں سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کا احساس

ہندوؤں نے انگریزوں کی شہ پاکر مدت سے مسلمانوں کے خلاف جو رویہ اختیار کر رکھا تھا بالآخر اس کا ردعمل شروع ہوا۔

تعلیم و تجربہ کی بدولت مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اگر ہندوؤں کے ان خاموش حملوں کا جو براہ راست مسلمانوں کی تہذیب، قومی روایات اور مذہب و معاشرت پر جاری ہیں کوئی معقول علاج نہ کیا گیا تو بہت جلد ہندوستان میں مسلم انفرادیت ہی کا خاتمہ ہو جائیگا اور مستقبل کے مسلمانوں کو ہمیشہ کے لئے برطانوی سنگینوں کے سائے میں بالکل ہندوؤں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑیگا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح اسوقت ہندوؤں کے زیر سایہ ہندوستان کی اچھوت اقوام بسر کر رہی ہیں۔ اس بھیانک تصور نے مسلمانوں کو چونکا دیا اور ان میں اپنے قومی وجود کی حفاظت کی خاطر حرکت پیدا ہو گئی۔

اردو زبان اور ذبیحہ گاؤ کے قضیہ پر مسلمانوں کے پلیٹ فارموں سے متواتر صدائے احتجاج بلند ہوئی اور مسلمانوں کے شہری اور سیاسی حقوق کی حمایت میں مسلم پریس نے اپنے کالم وقف کر دئے۔

اس طرح مسلم رائے عامہ کی تربیت شروع ہوئی اور مسلمانوں میں ہندو

انگریز مشترک) ہندوستانی سیاست کی بصیرت پیدا ہوتی گئی۔

ہندوستان پر تاج برطانیہ کے تسلط کے بعد اصلاحات کی سب سے پہلی قسط ۱۸۶۱ء میں عطا ہوئی جس کی رو سے مرکز اور صوبوں میں قانون ساز مجلسیں قائم کی گئیں اور ان میں ہندوستانیوں کو بھی اپنے ملک کے لئے قانون بنانے کا موقع دیا گیا لیکن ان مجلسوں کے ممبروں کی نامزدگی حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھی۔

۱۸۸۲ء میں لارڈ رپن (وائسرائے ہند) نے لوکل بورڈ اور میونسپل کمیٹیوں میں پڑھے لکھے ہندوستانیوں کے نمائندہ عنصر کی جگہ نکالی تاکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو اپنے اہل ملک کی خدمت کرنے کا موقع حاصل ہو اور ان میں شہری ذمہ داری کا احساس پیدا ہو جائے۔

۱۸۹۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے مرکزی اور صوبوں کی مجالس قانون ساز میں ممبروں کی تعداد بڑھا دی، اور گورنر جنرل اور گورنروں کو یہ ہدایت کی کہ ارکان مجالس کے انتخاب میں میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ، ایوان تجارت، زمینداروں اور یونیورسٹیوں وغیرہ کی نمائندگی کا خاص خیال رکھا جائے۔ اسی کے ساتھ ممبران مجالس قانونساز کے اختیار میں بھی ایک حد تک توسیع کر دی۔

مسلمانوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ان اصلاحات سے مسلمان کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اور ہندو بھائی جن پر حکومت مہربان بھی تھی اور تعلیم اور تجربہ میں بھی مسلمانوں سے بڑھے ہوئے تھے حکومت کے ہر شعبہ میں دخیل نظر آنے لگے تھے جہاں پہونچکر انہوں نے مورچہ بندی کر لی اور مسلمانوں پر بڑی بڑی آسامیاں تو ایک طرف رہیں معمولی سرکاری ملازمتوں کے دروازے بھی بند کر دیئے۔ اسی کے ساتھ جن اداروں میں حکومت نے طبقہ وار انتخاب کا طریقہ رائج کیا تھا ان میں تو مسلمانوں کو در آنے کا

کوئی امکان ہی نہ رہا تھا اس لئے کہ انتخاب مخلوط تھا، اور مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں اقلیت رکھتے تھے۔ جس کے باعث ہندؤں کی مدد کے بغیر وہ کسی طبقہ سے منتخب نہ ہو سکتے تھے اور ہندو اپنے قومی اور مذہبی تعصب کی بناء پر مسلمانوں کو ووٹ دینے سے گریز کرتے تھے۔

مسلمانوں کو جب متواتر تجربوں کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ ہندو بھائیوں کی ذہنیت بدل نہیں سکتی تو انہیں منظم طریقہ پر اپنے حقوق کی حفاظت کا خیال آیا۔ اسی خیال کا یہ نتیجہ تھا کہ ۱۸۹۳ء میں "ڈیفنس ایسوسی ایشن" کے نام سے علی گڑھ میں ایک سیاسی جماعت قائم ہوئی۔ اور جسٹس محمود نے انتخاب کے اصول پر ایک یادداشت مرتب کی جس میں مخلوط انتخاب کی سختی سے مخالفت کی تھی اور حکومت سے درخواست کی تھی کہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریقہ انتخاب کا اصول تسلیم کیا جائے۔ یہ مسلمانوں کی پہلی سیاسی انجمن تھی لیکن زیادہ دنوں زندہ نہ رہ سکی اور نہ کوئی نمایاں کام کر سکی اس لئے کہ اس انجمن کے کام کرنے والے وہی لوگ تھے جن کے کندھوں پر علی گڑھ کے انتظام کا بھی بار تھا اور وہ اپنی توجہ کسی قیمت علی گڑھ سے ہٹانا نہیں چاہتے تھے۔ لیکن مسلم حلقوں میں سیاسی بیداری بہرحال پیدا ہو چکی تھی اور مسلمانوں نے ہندوستانی سیاست میں پوری طرح دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ اسی سال یعنی ۱۸۹۳ء میں مہاراشٹرا کے مشہور لیڈر بال گنگادھر تلک نے پونا میں "مخالفین ذبیحہ گاؤ" کے نام سے ایک فرقہ دار جماعت قائم کر ڈالی جس نے مسلمانوں کے خلاف پوری شدت سے پروپگنڈا شروع کر دیا۔ اور شکایتوں کے ساتھ مسلمانوں کا اس فرقہ دار پروپگنڈے سے متاثر ہونا بھی لازمی تھا چنانچہ مسلم پریس میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی بحث چھڑ گئی اور اسلامی روایات کے تحفظ کی تدبیروں پر بحث و نظر کا ایک باب کھل گیا۔

اسی دوران میں اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگالہ کا اعلان کردیا۔ اس اعلان سے بنگال کے ہندوؤں میں اضطراب و بےچینی پیدا ہوگئی اس لئے کہ اس تقسیم سے بنگال کی ہندو قومیت پر ضرب لگتی تھی، کانگرس نے اس مقامی سوال کو آل انڈیا سوال بنادیا سارے ہندوستان میں جگہ جگہ ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف احتجاجی جلسے کئے اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا اور جب اس کا بھی حکومت پر کوئی اثر نہ ہوا تو بنگال کے ہندوؤں نے ایک طرف برطانوی مال کے "بائیکاٹ" کی تحریک شروع کردی اور دوسری طرف مسلمانوں پر جو عضو ضعیف بنے ہوئے تھے اپنی بھڑاس نکالنے لگے اس لئے کہ تقسیم بنگالہ سے جہاں ہندو قومیت کو نقصان پہونچتا تھا وہاں مسلمانوں کا تھوڑا سا فائدہ ہوتا تھا۔ اگرچہ تقسیم بنگالہ کا اعلان مسلمانوں کی درخواست پر نہیں ہوا تھا بلکہ خود بنگال کے اکثر مسلمان اس کے خلاف تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوؤں کے نزدیک مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانے کے لئے یہی الزام کافی تھا کہ اس تقسیم سے سراسر مسلمانوں کو فائدہ پہونچ رہا تھا، چنانچہ بنگال میں اکثر مقامات پر اور بہار اور اودھ میں کہیں کہیں شدید قسم کے ہندو مسلم فساد ہوئے جن سے ملک کی فضا را اور مکدر ہوگئی اور ہندو مسلمانوں کے تعلقات بہت زیادہ کشیدہ نظر آنے لگے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں اس سیاسی تکدر اور بےچینی کی ذمہ دار لارڈ کرزن کی ہندوستانی پالیسی تھی۔ لارڈ کرزن نہایت سخت مزاج اور بہت تیز فہم وائسرائے تھے اور ہندوستانیوں کی سیاسی صلاحیتوں کو وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ان کا اصول یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ملک کے نظم و نسق میں شریک کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا ملکی انتظام کے معیار کو اونچا کرنا۔

انہیں اندیشہ تھا کہ ہندوستانیوں کو سیاسی اختیارات ملنے سے نظم و نسق کا وہ

اعلیٰ معیار قائم نہیں رہ سکیگا جو ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسی کے ساتھ وہ ہندو مسلمانوں کی غیر مساوی سیاسی قوتوں میں بھی کسی قدر اعتدال پیدا کرنے کی طرف مائل تھے۔ چنانچہ لارڈ کرزن کا یہی اصول تقسیم بنگالہ کے ایجیٹیشن کو ہوا دینے کا موجب ہوا۔ اور ہندو عام طور پر ان سے اور ان کی حکومت سے ناراض نظر آنے لگے۔
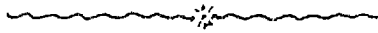
دوسرا باب (۲)

سیاست کے میدان میں مسلمانوں کا پہلا قدم

لارڈ کرزن کا شورشی دور ختم ہوا اور انہی کے ساتھ انگلستان کی قدامت پسند پارٹی کو بھی شکست ہو گئی اور اس کی جگہ لبرل پارٹی برسر اقتدار آ گئی۔ لارڈ مارلے وزیر ہند اور لارڈ منٹو وائسرائے مقرر کئے گئے۔ لارڈ منٹو نے ہندوستان آ کر یہاں کی مکدر فضا کو درست کرنے کے لئے اپنی کونسل کے چند ممبروں کی ایک کمیٹی بنائی تاکہ وہ ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ اور اسی کے ساتھ ہندوستان کے بعض صائب الرائے حضرات سے بھی لارڈ منٹو نے نجی ملاقاتیں کیں اور ان کا سیاسی نقطۂ نظر معلوم کیا۔ لارڈ منٹو یہ سب کچھ برطانوی پارلیمنٹ کے اشارے سے کر رہے تھے جہاں ہندوستان کو جدید اصلاحات دینے کی تجویز زیر غور تھی۔

جدید اصلاحات کی بھنک جب ہندوستانیوں کے کان میں پڑی تو تقسیم بنگالہ کے خلاف جو ایجیٹیشن جاری تھا وہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے بجائے جدید اصلاحات میں زیادہ سے زیادہ قومی حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔

مسلمانوں میں اگرچہ سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی لیکن اب تک ان کا کوئی سیاسی ادارہ یا کوئی ایسی آل انڈیا سیاسی جماعت قائم نہ ہوئی تھی جو اس موقع پر حکومت میں ان کی نمائندگی کرتی۔ اس زمانہ کے ذمہ دار مسلم افراد کو جن میں محسن الملک

وقار الملک اور سر آغا خاں کے نام پیش پیش نظر آتے ہیں یہ فکر ہوئی کہ وائسرائے پر مسلمانوں کا سیاسی زاویہ نگاہ کس طرح ظاہر کیا جائے۔ علی گڑھ میں مسلمانوں کے صاحب الرائے حضرات کی ایک کمیٹی بنی اور اس میں غور و مشورے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ مسلم نمایندوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملے اور انہیں مسلم نقطہ نظر سے مطلع کرے۔ وفد کو تیار کرنے کا کام محسن الملک کے سپرد کیا گیا جنہوں نے ملک کے مختلف مقامات پر دوڑ دھوپ کر کے مسلمانوں کے ذمہ دار افراد سے اس بارے میں رائیں حاصل کیں۔ بمبئی پہونچکر سر آغا خان کے مشورے سے وائسرائے کے ایڈرس کا مضمون تیار کیا۔ ۱۶ ستمبر کو لکھنؤ میں ہر صوبے کے نمائندہ مسلمانوں کا جلسہ کر کے ایڈرس کا مسودہ ان سے پاس کرایا اور یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو مسلم نمایندوں کے ایک وفد نے یہ ایڈرس لارڈ منٹو وائسرائے ہند کی خدمت میں پیش کر دیا۔

ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کا یہ پہلا عملی قدم تھا۔

چونکہ یہی ایڈرس ہندوستان میں مسلم سیاست کا سنگ بنیاد سمجھا جاتا ہے اس لئے ہم یہاں اس ایڈرس کے چند ضروری اقتباسات اور وہ مطالبات درج کئے دیتے ہیں جو مسلمانوں کے وفد نے وائسرائے ہند کے آگے پیش کئے تھے۔

ایڈرس کے ابتدائی حصہ میں ہندوستان کی مختلف قوموں کی سیاسی پوزیشن پر گفتگو کی گئی ہے اور ان قوموں میں مسلمانوں کا سیاسی مرتبہ متعین کیا ہے اس کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات کی روشنی میں مغرب کے ڈموکریٹک طرز حکومت کو جانچتے ہوئے لکھا ہے:۔

> " جو طریقہ نیابت و قائم مقامی رعایا کا یورپ میں رائج ہے وہ اہل ہند کے لئے بالکل نیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کے بعض دُور اندیش افراد کا خیال ہے کہ اس طریقہ کو ہندوستان کی موجودہ تمدنی اور

سیاسی حالت پر کامیابی کے ساتھ منطبق کرنے کیلئے نہایت حزم واحتیاط وماٰل اندیشی سے کام لینا پڑیگا جو اگر نہ لیا جا سکا تو منجملہ اور خرابیوں کے ایک بہت بڑی خرابی یہ پیش آئے گی کہ ہمارے قومی اغراض کا سیاہ وسفید ایک ایسی جماعت کے حوالہ ہوجائیگا جسے ہمارے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہے"

اور طبقہ وار مخلوط انتخاب کی کمزوریوں پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"الیکشن کے نتائج کی حالت یہ ہے کہ موجودہ قاعدوں کی رو سے یہ امر بعید از قیاس ہے کہ ان جماعتوں کی طرف سے جنکو انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے کسی مسلمان کا نام انتخاب کے لئے پیش کیا جائے۔ تاوقتیکہ وہ اہم معاملات میں اکثریت والی قوم کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو ہمارے ہندو ہم وطنوں کی یہ خواہش قابل اعتراض نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنی قوت سے پورا فائدہ اٹھا کر صرف اپنی قوم کے افراد کے حق میں ووٹ دیں یا غیر قوم کے ایسے کسی فرد کے حق میں جس کی نسبت یقین ہو کہ وہ ہندو کی کثیر جماعت کی خواہش کے مطابق رائے دیا کریگا اور اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ ہوگا کیونکہ آئندہ بھی دوبارہ انتخاب اس کا ہندوؤں کی رضامندی پر موقوف ہوگا"

اس کے بعد اپنی قومی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے مسلمانوں سے تغافل برتنے پر حکومت کو اس طرح ٹوکا ہے:۔

"قومی حیثیت سے ہم مسلمانوں کی ایک جداگانہ جماعت ہے جو ہندوؤں سے بالکل الگ ہے اور ہمارے بعض اغراض ومصالح ایسے ہیں جن کا

تعلق بلاشرکت غیرے ہماری ذات سے ہے اور جن میں کسی دوسری قوم کو دخل نہیں ہے اور چونکہ ان کی حفاظت وحمایت اس وقت تک پورے طور پر نہیں کی گئی اس لئے ہم مسلمانوں کو نقصان پہونچا حتیٰ کہ ان صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی تعداد بلحاظ آبادی بہت زیادہ ہے وہاں بھی اُن کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیا گیا گویا سیاسی حیثیت سے وہ بالکل بے وقعت ہیں اور گویا داعیۂ انصاف ان کے ساتھ بے اعتنائی کئے جانے کا مانع نہیں ہے پنجاب میں ایک حد تک یہی حال ہے مگر سندھ اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی حالت اس سے بھی بدتر ہے"

ایڈریس کے آخر میں مطالبات کی فہرست دی تھی جو اختصار کے ساتھ یہاں درج کی جاتی ہے :-

"(۱) مسلمانوں کو اپنے مخصوص حلقہ ہائے انتخاب سے خود اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق ہو۔

(۲) مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کو ملحوظ رکھ کر تناسب آبادی سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔

(۳) حکومت کی ملازمتوں میں تناسب آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو حصہ دیا جائے اور چیف کورٹ اور ہائی کورٹ میں مسلم جج اور ایگزیکٹیو کونسل میں مسلمان ممبر مقرر کئے جائیں۔

(۴) یونیورسٹیوں کی سنڈیکیٹ اور سینٹ میں مسلمانوں کی تعداد مقرر کی جائے۔

(۵) مسلم یونیورسٹی کے قیام میں مدد کی جائے"

حکومت نے تو اس ایڈرس کی پذیرائی کی لیکن ہندو بھائیوں کو مسلمانوں کی یہ ادا نہ بھائی کیونکہ اس ایڈرس اور ان مطالبات کے کھلے ہوئے معنی یہ تھے کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ اپنی انفرادیت قائم کرنی چاہتے ہیں اور ڈیموکریٹیک طرز حکومت کے مطابق "سچارٹی رول" کے آگے سر جھکانے کو تیار نہیں۔

یہ بات لڑائی کی تھی۔ اور لڑائی کی صورت میں یہ اندیشہ تھا کہ ملکی سیاست میں اپنی نومشقی کے باعث مسلمان کہیں نقصان نہ اٹھا بیٹھیں۔ چنانچہ اس موقع پر مسلمانوں کے چند اعتدال پسند حضرات نے مسلم مطالبات کو سمو دینا چاہا اور "جداگانہ انتخاب" کے بجائے جو ہندو مسلمانوں میں تفریق کا باعث تھا۔ تعین نشست کی شرط کے ساتھ مخلوط انتخاب پر ہندوؤں کو منا لینے کی تجویز پیش کی۔

تعین نشست کے ساتھ مسلمانوں کے لئے مخلوط انتخاب کو پسند کرنے والے حضرات کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ مخلوط انتخاب کو قبول کر لینے سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں اتفاق اور یکجہتی باقی رہے گی برخلاف اس کے جداگانہ انتخاب مسلمانوں کو ایک بڑے مقتدر ہندو گروہ سے بالکل علیحدہ کر دیگا جس سے دونوں قوموں میں بجائے محبت کے کشیدگی بلکہ رفتہ رفتہ دشمنی پیدا ہو جائیگی۔

اور وہ حضرات جو مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب پر زور دے رہے تھے انکی دلیل یہ تھی کہ مخلوط انتخاب کو قبول کر لینے کی صورت میں یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ حکومت میں مسلم مفاد کی صحیح ترجمانی ہو سکے۔ اور جب مسلم مفاد ہی محفوظ نہ رہ سکا جو ہندوستان میں مسلمانوں کے قومی وجود کا ضامن ہے تو پھر بڑے مقتدر ہندو گروہ کی محبت اور ہمدردی مسلمانوں کے کس کام آسکتی ہے۔؟

اسی خیال کو عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور اسی اصول پر ہندوستان میں جداگانہ مسلم سیاست کی تعمیر شروع ہو گئی۔

اگرچہ مخلوط انتخاب کے مسلمان حامیوں کا گروہ بدستور باقی رہا بلکہ اب تک باقی چلا آتا ہے لیکن مسلم اکثریت کی حمایت نہ اُسے اسوقت حاصل ہو سکی اور نہ آج حاصل ہے یہ "ریشنل" خیال کی ایک مختصر سی جماعت ہے جس نے حقائق کی پیچیدگیوں اور عمل کی دشواریوں کو نظر انداز کر کے اپنے نظری زاویوں میں اسقدر وسعت پیدا کر لی ہے کہ قومی وجود اور قومی مفاد کا سوال اس کی وسعتوں میں گم ہو کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ جماعت باوجود مسلمان ہونے کے مسلمانوں کی نہیں بلکہ اپنی آپ نمائندہ کہلاتی ہے *

تیسرا باب (۳)

مسلم لیگ ـــــ مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت کا قیام اور اسکا نصب العین

مسلم مطالبات کو تفصیل کے ساتھ وائسرائے ہند کے آگے پیش کر چکنے کے بعد یہ سوال زیر غور آیا کہ ان مطالبات کی تکمیل کے لئے وائسرائے سے خط کتابت کون کرے اور اس سلسلہ میں اگر بعض تشریح طلب مسائل پیش آجائیں تو انہیں کون صاف کرے۔ یہ ناممکن تھا کہ ہر مرتبہ ان سب حضرات کو یکجا جمع کیا جاتا جو وفد کے ممبر تھے اور یہ بھی ممکن نہ تھا کہ یہ کام بغیر سب کے مشورے کے ان میں سے دو تین حضرات کے سپرد کر دیا جاتا۔ بالآخر اس سوال کو محسن الملک نے اس طرح حل کیا کہ ان ممبروں کو ساتھ لیکر جو وفد میں شریک تھے مسلمانوں کی ایک مرکزی انجمن بنا ڈالی جائے اور یہ کام اس انجمن کے صدر اور سکرٹری کے سپرد کر دیا جائے جس کے لئے وہ ملک کے مسلمانوں کے آگے جواب دہ رہیں گے۔

مسلمانوں کا اسوقت تک کوئی سیاسی مرکزی ادارہ نہیں تھا اور بہت دنوں سے مسلمان اس کی ضرورت کو محسوس کر رہے تھے۔ اب جو محسن الملک نے یہ تجویز پیش کی تو ہندوستان کے طول و عرض سے اس کی تائید ہوئی اور محسن الملک کو مجبور کیا گیا کہ جلد سے جلد اس مرکزی سیاسی جماعت کی تشکیل کر دیں۔ نواب سلیم اللہ خان بہادر نواب ڈھاکہ نے [illegible] سیاسی جماعت کی تشکیل ڈھاکہ میں کیجائے

چنانچہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں سارے ہندوستان کے مسلم نمائندے جمع ہوئے اور نواب وقار الملک کی زیر صدارت "مسلم لیگ" کے نام سے ایک مرکزی سیاسی جماعت کی تاسیس عمل میں آگئی۔ سکریٹری اس جماعت کے نواب وقار الملک منتخب ہوئے اور جائنٹ سکریٹری نواب محسن الملک بنائے گئے۔ اور اس جماعت کا نصب العین تجویز ہوا :-

"مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی محافظت و ترقی اور حکومت کی وفاداری کے ساتھ ہمسایہ اقوام سے اتفاق و اتحاد بڑھانے کی کوشش"

مسلمانوں کی ان سیاسی سرگرمیوں کو ہندو بھائیوں نے کس نظر سے دیکھا اسکا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ادھر مسلم لیگ کی تشکیل کی کوشش ہو رہی تھی اُدھر اس کے جواب میں "ہندو مہا سبھا" کے قیام کا خاکہ تیار ہونے لگا اور ٹھیک انہی تاریخوں میں جن تاریخوں میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ عالم وجود میں آئی لاہور میں "ہندو مہاسبھا" کے نام سے ایک خالص ہندو جماعت قائم کر لی گئی۔ اور اس کا نصب العین ہندوؤں کے مذہبی اور سیاسی حقوق کی محافظت تجویز ہوا۔

مسلم لیگ کے جواب میں ہندو مہا سبھا کا قیام اور اس نصب العین کیساتھ کہ ہندوستان کی "اکثریت" کی جو سیاسی اور سماجی حیثیت سے ہر جگہ مسلمانوں سے بہر حال بہتر حالت میں ہے ہندو بھائیوں کا ایک ایسا اقدام تھا جس نے ملک کی فضا کو اور زیادہ خراب کر دیا۔ لیکن مسلمان بہر حال سیاسی میدان میں آچکے تھے اور یہ سمجھ کر آئے تھے کہ ان کی یہ حرکت مستقلاً ہندو بھائیوں کے قہر و غضب کا نشانہ بنیگی اس لئے اب اُلٹے قدم واپس جانے کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہا تھا۔ بلکہ سوال اب ہر قیمت پر اپنے قومی وجود کو بچانے کا تھا، چنانچہ مسلمان اس کی پرواکئے بغیر کہ ہندو انکا راستہ کاٹ رہے ہیں اپنے مطالبات پر جم گئے اور ان کی تکمیل کے لئے

حکومت پر زور ڈالنا شروع کر دیا۔

لارڈ منٹو نے اس دوران میں ہندوستان کی سیاسی حالت کے متعلق اپنی رپورٹ مرتب کر لی تھی جس میں مسلمانوں کا زاویہ نظر بھی پیش کر دیا تھا لیکن اپنی طرف سے بعض صورتوں میں مخلوط انتخاب کی بھی سفارش کر دی۔ مسلمانوں کو جب اس کی اطلاع ملی تو ہندوستان میں جگہ جگہ اس کے خلاف احتجاجی مظاہرے کئے اور لندن میں جسٹس امیر علی کی صدارت میں ایک وفد بھی وزیر ہند لارڈ مارلے کی خدمت میں پیش ہوا اور اس نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کو حکومت کے آگے پوری قوت اور زور سے پیش کیا۔ ابتدائً لارڈ مارلے اس اصول کو تسلیم کرنے میں کسی قدر متامل ہوئے لیکن بعد میں انہوں نے مسلمانوں کا یہ مطالبہ مان لیا اور "منٹو مارلے" اسکیم میں اسکو بہ جنسہ تسلیم کر لیا۔ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کے وجود کا یہ پہلا اعتراف تھا۔

مسلم لیگ جب ہندوؤں کی مخالفت کے علی الرغم قائم ہو ہی گئی اور اس نے اپنا کام بھی سرگرمی سے شروع کر دیا تو ہندو بھائیوں نے ملک کے عرض و طول میں اس کے خلاف یہ پروپگنڈا شروع کر دیا کہ:۔ "یہ سرکار پرستوں کی جماعت ہے۔ سرکار ہی کے اشارے سے عالم وجود میں آئی ہے اور سرکار سے وفاداری اور ہندو مسلم تفریق اس کا شعار ہے"!

اس پروپگنڈے سے ہندو تو عام طور پر مسلم لیگ سے بدظن ہو ہی گئے تھے۔ ایک مخصوص مسلم حلقے سے بھی اس جماعت کے متعلق بدگمانی کا اظہار کیا جانے لگا۔

یہ مخصوص مسلم حلقہ انہی آزاد خیال مسلمانوں کا تھا جن کے زاویہ نظر کی وسعتوں میں مسلم انفرادیت بالکل گم ہو کر رہ گئی تھی اور جن کا مسلک یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمان بنکر نہیں بلکہ ہندوستانی بنکر رہو اور اپنی قلت کو کثرت میں ضم کر دو۔

اس مسلک کے جذب و کشش میں کس کو کلام ہو سکتا ہے! لیکن سوال یہ ہے کہ

کسی سیاسی مسلک کے تعین میں حالات و واقعات کا لحاظ رکھا جانا بھی ضروری ہوتا ہے یا نہیں؟ انگریزوں کی حکومت کے بعد سے ہندو بھائیوں نے مسلمانوں کے خلاف جو رویہ اختیار کیا اور ہندو مسلمانوں کی مشترک تہذیب، مشترک زبان اور مشترک معاشرت کو جنکے باعث ہندوستان میں ایک مشترک قومیت کی نمو کا امکان پیدا ہو گیا تھا جس بری طرح اپنے پیروں کے نیچے روندا اور پامال کیا بلکہ نہایت احتیاط سے اس کے نقوش تک مٹا دیئے ان حرکتوں کا ردعمل مسلمانوں پر ہونا کیا اصول فطرت کے خلاف کہا جا سکتا ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کا احساس خود بخود نہیں ہوا بلکہ دلایا گیا۔ برادران وطن نے جب ہندوستان کے مشترک تمدن کو پامال کر دیا اور "ہندوستانیت" سے دست بردار ہو کر پانچ ہزار برس قبل کی ٹھیٹ ہندو قومیت کے احیاء پر متوجہ ہوئے تو مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہ رہا کہ وہ بھی اپنے آپ کو مسلمان سمجھیں۔ اسلئے نہیں کہ ہندوؤں کی اس ذہنیت کا انہیں جواب دینا ضروری تھا بلکہ اس لئے کہ "ہندومت" کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب میں اپنی "قومی انفرادیت" کی حفاظت ان پر لازمی ہو گئی تھی۔

ایسے حالات میں جبکہ ہندوؤں نے اپنے آپ کو صرف "ہندو" محسوس کرنا شروع کر دیا ہو، مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا کہ ہندوستان میں مسلمان بنکر نہیں بلکہ ہندوستانی بنکر رہیں ستم ظریفی نہیں تو کیا ہے!

رہا یہ اعتراض کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کی جماعت ہے اور سرکار ہی کے اشارے سے عالم وجود میں آئی ہے، محض غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مسلم لیگ کے بانی کانگرس کے بانیوں سے زیادہ سرکار پرست نہیں تھے اور مسلم لیگ کی تاسیس میں اس سے زیادہ حکومت کا ہاتھ نہیں تھا جتنا کانگرس کی تشکیل میں تھا۔

مسٹر ہیوم سے بڑھکر اور کون سرکار پرست ہو سکتا تھا جو حکومت کے ہم قوم بھی تھے

اور ساری عمر حکومت کے نمک خوار بھی رہ چکے تھے؟ اور کانگرس کی تشکیل میں اس سے زیادہ اور کیا حکومت کا ہاتھ ہو سکتا تھا کہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ڈفرن نے خود ہی مسٹر ہیوم کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اس ملک میں انگلستان کے انداز پر ایک اپوزیشن پارٹی بننی چاہیئے جو حکومت میں ہندوستانی نقطۂ نظر پیش کیا کرے اور حاکم و محکوم میں غلط فہمیاں نہ بڑھنے دے۔؟ لارڈ ڈفرن اور مسٹر ہیوم کے متعلق آپ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہ کوئی ایسی جماعت قائم کر سکتے تھے جو ہندوستانیوں کے لئے مفید اور حکومت برطانیہ کے مفاد کے خلاف ہوتی! لیکن اس کے باوجود یہ حسن ظن ملاحظہ کیجئے کہ کانگرس سرکار پرستوں کی نہیں آزاد خیال ہندوستانیوں کی جماعت تھی! اور اس کے برخلاف مسلم لیگ جس کی تاسیس اس شخص (نواب محسن الملک) کے ہاتھوں عمل میں آئی جس سے اس کی سیاسی سرگرمیوں کے باعث حکومت اس قدر ناراض تھی کہ اسے اپنا خطاب بھی استعمال کرنے سے منع کر دیا تھا اور جب مسلم مطالبات کو حکومت کے آگے پیش کرنے کا سوال پیدا ہوا تھا تو مسلم وفد کو بار دینے سے پہلے اسوقت کے وائسرائے لارڈ منٹو نے اپنا یہ اطمینان کر لیا تھا کہ مسلم وفد سرکار، کے خلاف زہر تو نہ اگلیگا۔

اس کے متعلق یہ بدگمانی دیکھیئے کہ یہ فرقہ پرور سرکار پرستوں کی جماعت قرار دیدی گئی!!

~~~~~~~~~ ※ ~~~~~~~~~

رہا سرکار سے وفاداری اور غیر وفاداری کے اظہار کا سوال، یہ اسقدر پیچیدہ نہیں ہے کہ اس کے سمجھنے میں دشواری ہو۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگرس کا نصب العین ہندوستان کے نظم و نسق میں ہندو اقتدار بڑھانے کے سوا اور کچھ نہیں رہا اور اس کے بعد بھی بظاہر نصب العین میں تبدیلی ہوتی گئی لیکن اصلی روح ہمیشہ یہی قائم رہی، اس اعتبار سے کانگرس کو یہ کہنے کا موقع ہی نہ تھا کہ وہ حکومت کی غیر وفادار ہے، اسلیئے کہ حکومت سے غیر وفاداری کا اظہار کیا جاتا تو اصلاحات کس سے طلب کی جاتیں؟ البتہ
~~~~~~~~~

لارڈ کرزن کے عہد میں بنگال میں سیاسی دہشت انگیزوں کا ایک گروہ ضرور پیدا ہو گیا تھا جو علانیہ حکومت برطانیہ سے بغاوت کرتا تھا لیکن کانگرس نے کبھی اس گروہ کو اپنے اندر شامل نہیں کیا بلکہ یہ یقین دلانے کے لئے کہ کانگرس سے کبھی اس گروہ کا تعلق نہیں رہا کانگرس پلیٹ فارم سے ہمیشہ اس گروہ کی مخالفت ہوئی اور اس کی سرگرمیوں پر اظہار بیزاری کیا گیا۔ اسی کے ساتھ بالواسطہ یا بلا واسطہ حکومت کو ہمیشہ یہ باور کرایا جاتا رہا کہ کانگرس تاج برطانیہ کی پوری طرح وفادار ہے اور ہمیشہ رہے گی اختلاف اگر اسے کچھ ہے تو صرف یہاں کی سول سروس سے ہے۔ عہ

کانگرس کا یہ مسلک اسقدر صاف تھا کہ اس کے پڑھنے میں نہ اسوقت کوئی رفت تھی اور نہ آج کوئی روک ہو سکتی ہے لیکن اس کے باوجود اگر کانگرس کی آنکھ کا یہ "شہتیر" کسی نظر باز کو نہ سوجھے اور مسلم لیگ کی آنکھ کے تنکے کو دیکھ کر وہ غل مچانے لگے کہ مسلم لیگ سرکار کے وفاداروں کی جماعت ہے تو اس غریب کے متعلق اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کی بصارت اور بصیرت دونوں پر مہر لگ گئی ہے اور خود اُسے اپنے وجود کا بھی ہوش نہیں رہا ہے وہ دیکھتا ہے لیکن دوسروں کی آنکھوں سے وہ سنتا ہے مگر دوسروں کے کانوں سے وہ سوچتا ہے مگر دوسروں کے دماغ سے اور یہ خود فراموشی کا عالم یقیناً قابل تعریف نہیں بلکہ قابل رحم ہے!

عہ۔ اس کا ثبوت تیسرے باب میں کانگرس کے مشہور لیڈر اور قوم پرستوں کے امام لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کی تقریروں سے پیش کیا گیا ہے (مولف)

چوتھا باب (۴)

دورِ انتشار۔ اور مسلم سیاست میں نئی روح

مسلم لیگ کے قیام کے بعد سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اس درجہ خراب اور کشیدہ ہو گئے کہ مستقبل میں بھی ان دونوں قوموں کا ملکی مفاد پر بھی متحد ہونا محال نظر آنے لگا۔ اس صورتِ حال سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں چند اعتدال پسند حضرات کو سخت تردُّد ہوا اور انہوں نے پریس اور پلیٹ فارم کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے باقاعدہ جدوجہد شروع کر دی لیکن اس جدوجہد کا انداز بہت عجیب تھا۔ ہندو مسلمانوں کیلئے اور مسلمان، ہندوؤں کے لئے تو ناصح مشفق بنے ہوئے تھے لیکن خود اپنے سامنے ان دونوں میں سے کسی ایک کے پاس بھی آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کا کوئی عملی پروگرام نہیں تھا۔ اور ہوتا بھی کیونکر۔ بنائے کشیدگی سطحی نہیں تھی بنیادی تھی۔ سوال چند سیاسی حقوق کا نہ تھا قومی انفرادیت کے تحفظ کا تھا۔

"ہندوستانی قومیت" کی تفسیر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک علیحدہ علیحدہ تھی، سیاسی سماجی اور مذہبی مفاد دونوں قوموں کے ایک دوسرے سے مختلف تھے اور سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی کہ ہندو اور مسلمانوں کے "شہری حقوق" اس بُری طرح ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے کہ جبتک دونوں قوموں کے زاویہ نظر نہ ٹھیک ہو جائیں انہیں سلجھایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

غرض یہ صورت حال تھی جس کے باعث ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں بیکار گئیں اور آپس کے تعلقات میں کھنچاؤ بدستور باقی رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال اور مہاراشٹرا میں حکومت کے خلاف ایجیٹیشن زور پکڑ گیا، اور دہشت انگیزوں کی سرگرمیوں میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ خصوصاً نوجوان طبقہ علانیہ حکومت کے خلاف صف آرا نظر آنے لگا تھا حکومت نے اس گروہ سے مقابلہ کے لئے تشدد سے کام لیا بنگال مہاراشٹرا اور آندھرا وغیرہ میں گرفتاریاں کیں اور گرفتار شدگان کو لمبی مدت کے لئے جیل بھیجنا شروع کر دیا اسی سلسلہ میں بال گنگا دھر تلک بھی گرفتار ہوئے اور چھ برس کے لئے جیل بھیج دیئے گئے ہندوستان کی اس سیاسی بےچینی کو دور کرنے کے لئے حکومت نے جلدی سے "منٹو مارلے" اصلاحات کا نفاذ کر دیا۔ اسوقت ہندوؤں میں دو گروہ پیدا ہو گئے تھے ایک انتہا پسند دوسرا اعتدال پسند، انتہا پسند تو ان اصلاحات کا مقاطعہ کرنا چاہتے تھے لیکن اعتدال پسند اس کے حق میں تھے کہ جو اصلاحات حکومت دے رہی ہے اُسے قبول کر لیا جائے۔ چنانچہ مسٹر گوکھلے سر سریندر ناتھ بنرجی وغیرہ نے جو اعتدال پسند گروہ سے تعلق رکھتے تھے ملک کو اس پر آمادہ کیا کہ منٹو مارلے اصلاحات سے فائدہ اٹھایا جائے۔

اصلاحات نافذ ہوئیں جو ہر اعتبار سے پچھلے قانون سے بہتر تھیں ہندوستانیوں میں حق نیابت بھی کسی قدر زیادہ دیا گیا تھا کونسلوں کے اختیارات بھی بڑھا دیئے تھے اور ملک کے ہر مسئلہ سے کونسلوں میں گفتگو کرنے کی آزادی دیدی تھی۔ اور مسلمانوں کے لئے چونکہ جداگانہ انتخاب کا اصول بھی تسلیم کر لیا تھا اس لئے مسلمانوں نے ان اصلاحات پر اظہار اطمینان کیا۔ اور انہیں کامیاب بنانے میں ہندوؤں کے اعتدال پسندوں کے ساتھ ہو گئے۔ لیکن ہندوؤں کے انتہا پسند گروہ کی سرگرمیاں اصلاحات کے نفاذ کے بعد بھی جاری رہیں اور ان سرگرمیوں سے ملک میں بےچینی بھی برابر قائم رہی۔

مسلم لیگ کا اقتدار رفتہ رفتہ مسلمانوں میں بڑھتا جا رہا تھا۔ ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۰ء تک کراچی امرتسر دہلی اور ناگپور میں اس کے چار اجلاس ہو چکے تھے اور ان اجلاسوں میں مسلم مفاد پر متعدد قراردادیں منظور کی گئیں تھیں جنہوں نے مسلم رائے عامہ کی تربیت اور مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر کے تعین میں بڑی مدد دی تھی۔ لیکن مسلمان اب سیاست کے میدان میں تیز گامی دکھانی چاہتے تھے، ہندوؤں کی طرح مسلمانوں میں بھی ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جو ملکی معاملات میں ایک قدم آگے بڑھ کر برادران وطن کے دوش بدوش حصہ لینا چاہتا تھا۔ اس کے نزدیک مسلم سیاست اس وقت تک کچھ بیرنگ سی تھی، اس میں وہ جوش اور سرگرمی نہیں پائی جاتی تھی جو سیاسی تحریکوں کے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے۔ وہ مسلم نقطہ نظر میں وسعت پیدا کرنی چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ مسلمان صرف اپنے ہی متعلق نہ سوچیں بلکہ ہندوستان کی سیاست میں بھی اپنے آپ کو دخیل رکھیں۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی پھر ہندو مسلم اتحاد کی تحریک اٹھی اس لئے کہ ہندوستانی سیاست میں برادران وطن کے دوش بدوش جگہ بنا لینے کی یہی ایک معقول تدبیر تھی۔ چنانچہ سر وڈبرن کی تحریک اور سر آغا خاں اور سید امیر علی کی تائید سے الہ آباد میں ایک اتحاد کانفرنس منعقد کی گئی اور اس کانفرنس میں دونوں قوموں کے بنیادی اختلافات کو پاٹنے کی پوری سرگرمی سے کوشش ہوئی لیکن فضا سازگار نہیں تھی۔ ہندو مسلم نقطہ نظر میں اتفاق نہ ہو سکا اور کانفرنس ناکام رہی۔

لیکن اس ناکامی سے مسلمانوں کے حوصلے پست نہیں ہو گئے بلکہ ملکی سیاست سے ان کی دلچسپی برابر بڑھتی ہی گئی اسی دوران میں تاجپوشی کے موقع پر تاج برطانیہ کی طرف سے تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا اعلان ہو گیا جس نے ہندوؤں کو تو بہت مسرور کیا لیکن مسلمانوں میں اس سے بڑی بےچینی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ بنگال کی تقسیم کا مسلمانوں کی

طرف سے کبھی کوئی مطالبہ نہیں تھا لیکن لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا اعلان کرتے ہوئے یہ بیان کیا تھا کہ اس تقسیم سے بنگال کے مسلمانوں کی اصلاح اور ترقی مقصود ہے۔ چنانچہ اسی بیان سے بنگال میں اور دوسرے مقامات پر ہندو مسلم تعلقات خراب ہوئے اور جگہ جگہ فساد ہو گیا۔ اور مسلمانوں کو وائسرائے کے اس اعلان کے بعد خواہ مخواہ ہندو بھائیوں کے مقابل ہونا پڑا حالانکہ اس تقسیم سے انہیں اتنا فائدہ نہیں پہونچا تھا جتنا آپس کی کشیدگی سے نقصان کا اندیشہ تھا اور اس وقت جب کہ آپس کی کشیدگی اسقدر بڑھ گئی کہ اس کا دور کرنا مشکل ہو گیا حکومت نے تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کر کے تعلقات میں مزید تلخی پیدا کر دی۔

اس اعلان تنسیخ کا مسلمانوں کے اُن قدامت پرست لیڈروں پر بہت بُرا اثر ہوا جو مسلمانوں کو سیاست میں میانہ روی کی تلقین کرتے رہے تھے اور ان آزاد خیال مسلمانوں کو ابھرنے کا موقع مل گیا جو مسلم لیگ کی موجودہ پالیسی سے مطمئن نہیں تھے چنانچہ اس واقعہ کے بعد قدامت پرست لیڈر خود بخود مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ہٹ گئے، آزاد خیال مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہو گیا۔ مسلم سیاست میں جوش اور سرگرمی کا عنصر بڑھ گیا اور اسی کے ساتھ مسلم زاویہ نظر میں وسعت اور ہمہ گیری بھی پیدا ہوتی گئی۔

یہاں سے مسلم سیاست کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔

۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کا اجلاس نواب صاحب ڈھاکہ کی زیر صدارت کلکتہ میں منعقد ہوا، اس اجلاس میں پچھلے سارے اجلاسوں کی نسبت بہت زیادہ جوش و خروش پایا گیا۔ اور ملکی معاملات پر بھی نقد و بحث کے دوران میں کافی آزاد خیالی کا مظاہرہ کیا گیا۔ اسی سال حالات کے پیش نظر لیگ کے نصب العین اور دستور اساسی میں مناسب

ترمیم کی تحریک پیش ہوئی جو حصول آرا کے لئے مسلم لیگ کے ممبروں کے باعث گشت کرائی گئی۔

اسی سال جنگ طرابلس کے بعد جنگ بلقان چھڑ گئی، عام مسلمانوں میں سلطنت ترکی کے لئے سخت بیچینی اور سراسیمگی پیدا ہو گئی، ترکوں کی امداد کے لئے ہندوستان کے طول وعرض میں چندے اکٹھے کئے جانے لگے، مولانا شوکت علی نے اس مطلب کے لئے انجمن خدام کعبہ قائم کی کتنی جگہ جگہ دورہ کر کے مسلمانوں کو گرمانے لگے۔ مولانا محمد علی کامریڈ کے ذریعہ مسلمانوں میں جوش اور سرگرمی عمل کی نئی روح پھونکنے لگے اور مولانا ابوالکلام آزاد کے الہلال نے وطنی اور اسلامی سیاست کے رازہائے سربستہ کھولکر مسلمانوں کو خواب گراں سے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بیدار کرنا شروع کر دیا۔

سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی اور ان میں نئی روح اور نئی زندگی کروٹیں لینے لگی۔ غرض وارفتگی اور سرشاری، جوش اور سرگرمی کی وہ کیفیت مسلمانوں میں پیدا ہو گئی جس نے حکومت اور برادران وطن دونوں کو اچنبھے میں ڈال دیا۔ سیاسی جمود رخصت ہوا، شکوک وشبہات کی جگہ عزم وحوصلہ نے سنبھالی۔ اور مسلمان پھر ایک مرتبہ وطنی سیاست میں رہنمائی کے منصب پر فائض نظر آنے لگے۔

۱۹۱۳ء میں نہایت شان شوکت سے مسلم لیگ کا چھٹا اجلاس لکھنؤ میں ہوا اس اجلاس کو مسلم لیگ کی تاریخ میں اسلئے اہمیت حاصل ہے کہ اسی اجلاس میں مسلم لیگ کا نصب العین:-

"برادران وطن سے اتحاد اور ہندوستان کے لئے مناسب حال حکومت خود اختیاری حاصل کرنا"

قرار پایا۔ پچھلے چند برسوں میں مسلمانوں نے اپنے جوش عمل سے وطنی سیاست میں

جو مرتبہ حاصل کر لیا تھا اس کا اعتراف برادران وطن اور حکومت دونوں کو کرنا پڑا۔ لیگ اور کانگریس میں چونکہ اس نصب العین کے بعد گفتگوئے مصالحت کا دروازہ کھل چکا تھا اس لئے دوبارہ ہندو مسلم اختلافات کو طے کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس کام کے لئے ملک کی فضا کو ہموار کیا جانے لگا۔ اسی سال ترکی اور ریاستہائے بلقان میں صلح ہو گئی اگرچہ اس صلح سے ترکی کا بہت نقصان ہوا لیکن وہ خطرہ بہرحال ٹل گیا جو یورپ میں ترکوں کے وجود کے لئے پیدا ہو گیا تھا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کو ایک الجھن سے نجات مل گئی۔

لیکن اس سال ہندوستان میں دو بہت ہی ناگوار واقعات پیش آ گئے جنہوں نے مسلمانوں کو سخت بےچین کر دیا۔ ایک واقعہ حکومت کی طرف سے کانپور کی مسجد کے ایک حصہ کو شہید کرنے کا تھا اور دوسرا واقعہ گائے کی قربانی پر اجودھیا میں ہندو مسلم فساد کا تھا۔

کانپور کی مسجد کے قضیہ میں حکومت اودھ نے غلطی یہ کی کہ ان مسلمانوں پر جو حکومت کی اس روش کے خلاف احتجاج کرنے مسجد کے آگے جمع ہوئے تھے گولی چلا دی جس سے بہت سے مسلمان شہید ہو گئے۔ اس واقعہ سے مسلمانوں میں سخت اشتعال پیدا ہو گیا اور یہ معاملہ جو حکومت اودھ کی نااہلی اور بے جا نمائش اقتدار کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا ایک آل انڈیا مسئلہ بن گیا اور سارے ہندوستان کے مسلمان حکومت کے خلاف ایجیٹیشن کی تیاریاں کرنے لگے لیکن اسوقت کے وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے بات بڑھتے نہ دی اور فوراً معاملہ اپنے ہاتھ میں لیکر اس مسئلہ کو مسلمانوں کے حسب مرضی سلجھا دیا۔ اسی طرح اجودھیا کا فساد بھی شدید نہ ہونے پایا دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں نے روک تھام کر لی اور گائے کی قربانی ہونے کے اس فساد کو فرو کر دیا گیا۔

ان واقعات سے ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا میں پھر کسی قدر تکدر کے آثار پیدا ہو گئے اور قدامت پرستوں کے اس گروہ کو جو لیگ کے پلیٹ فارم سے ہٹ آیا تھا اور جو لیگ کے دستور اور نصب العین کی ترمیم سے خوش نہیں تھا یہ شکایت کرنے کا موقع مل گیا

کہ مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں حکومت اور برادران وطن کو مداخلت کرنے کی جرأت محض
لیگ کے ان آزاد خیال افراد کے باعث پیدا ہوئی ہے لیکن یہ اختلاف آزاد خیال مسلمانوں
کی دور اندیشی اور مصلحت بینی کے باعث معمولی رنجش سے آگے نہ بڑھنے پایا اور دسمبر
۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا ساتواں اجلاس آگرہ میں بہ خیر خوبی ختم ہو گیا۔

مسلم لیگ کی اس قرارداد پر جو اس نے ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنے پچھلے اجلاس
میں منظور کی تھی، کانگرس اور حکومت دونوں نے توجہ دی۔ حکومت نے اس لئے کہ ان
دونوں کے اختلافات سے اس کی راہ میں سخت مشکلات پیدا ہو گئی تھیں اور کانگرس
نے اس لئے کہ اس مسئلہ کے حل کے بغیر وہ آگے نہ بڑھ سکتی تھی۔

اپریل ۱۹۱۴ء میں سر جیمس مسٹن نے الہ آباد میں ہندو مسلمانوں کی ایک اتحاد
کانفرنس بلائی اور اختلافی مسائل پر بڑی دیر تک تبادلہ خیال کیا اور بالآخر ان مسائل کو
سلجھانے کے لئے راجہ صاحب محمود آباد کی صدارت میں ایک کمیٹی بنا دی۔ یہ کوشش اسلئے
شروع ہوئی تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے لیے مزید اصلاحات کی تجویز
زیر غور آ گئی تھی اور ضرورت یہ محسوس کی جا رہی تھی کہ لیگ اور کانگرس دونوں ان اصلاحات
کے خلاف ہم آواز رہیں۔

مئی ۱۹۱۴ء کو جدید اصلاحات کے متعلق اپنا نقطہ نظر برطانوی پارلیمنٹ پر واضح
کرنے کے لئے کانگرس نے مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ایک وفد لندن بھیجا مسٹر
جناح اسوقت کانگرس کے چوٹی کے لیڈروں میں شمار ہوتے تھے اور پچھلے ہی سال مسلم
لیگ سے بھی ان کا تعلق ہو گیا تھا۔ لندن میں انہوں نے کانگرس کے نقطہ نظر کی نہایت
خوبی سے ترجمانی کی لیکن عین اسوقت جب ان کا وفد پوری سرگرمی سے لندن میں اپنے
مقصد کی تبلیغ کر رہا تھا، یورپ کا سیاسی مطلع یکایک غبار آلود ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے

یورپ میں جنگ کے شعلے بھڑکنے لگے اور خود برطانیہ بھی ان شعلوں کی زد میں آگیا۔

جنگ کے دوران میں اصلاحات کا کس کو خیال آسکتا تھا چنانچہ یہ تجویز اختتام جنگ تک کے لئے ملتوی ہوگئی اور اس پہ غور ہونے لگا کہ اس جنگ کے متعلق ہندوستان کا رویہ کیا ہونا چاہئے۔ اسی سال گاندھی جی نئے نئے جنوبی افریقہ سے ہندوستان واپس آئے تھے اور کانگرسی حلقوں کی نظریں رہنمائی کے لئے ان پر جمی ہوئی تھیں انہوں نے آتے ہی اعلان کیا کہ:۔

"ہندوستان کے ہر تندرست باشندے کو اس نازک وقت میں سلطنت برطانیہ کی امداد کرنی چاہئے کیونکہ صرف اسی خدمت کے بعد ہندوستان برطانوی سلطنت میں اعزاز کے ساتھ برابر کا شریک ہوسکتا ہے"

(ریپرز منٹو اینڈ نس ص۱۴۲)

گویا کانگرس نے جنگ کے متعلق فوراً ہی اپنی پالیسی متعین کرلی لیکن مسلم لیگ نے ابھی اپنا عندیہ ظاہر نہیں کیا اسلئے کہ آثار یہ بتا رہے تھے کہ اس جنگ میں اسلامی ممالک بھی لپیٹے میں آنے والے ہیں اور ترکی کے بھی جنگ میں کود پڑنے کا اندیشہ ہوگیا ہے اور مسلمان اپنی پالیسی کے اعلان سے پہلے یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مسلم حکومتوں کے متعلق برطانیہ کا رویہ کیا ہے۔ ۱۹۱۵ء میں یہ بھی ظاہر ہوگیا۔ مصر پہ برطانیہ نے فوجی قبضہ کرلیا، عرب میں انقلاب کے شعلے بھڑکنے لگے۔ اور ترکوں اور برطانیہ کے درمیان باقاعدہ لڑائی شروع ہوگئی۔

اس صورت حال سے علماء کا وہ گروہ سب سے زیادہ متاثر ہوا جو کبھی برطانیہ سے تعاون کا روادار نہیں تھا اور جس نے سر سید کی بھی اسی لئے تکفیر کی تھی کہ وہ مسلمانوں کو برطانیہ سے اشتراک عمل کی دعوت دیا کرتے تھے اور جو کانپور کی مسجد کے واقعہ کے

بعد مسلمانوں میں پھر کسی قدر ابھر آیا تھا اور کچھ آزاد خیال مسلمان بھی اس معاملہ میں اس گروہ کے ساتھ ہو گئے جس نے حکومت کی اس روش کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کردی۔

جنگ شروع ہوتے ہی حکومت نے ہندوستان میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کر دیا تھا اس ایکٹ سے کام لیتے ہوئے اس نے مسلمانوں کے پر جوش اور آزاد خیال لیڈر مولانا شوکت علی مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسرت موہانی کو غیر محدود مدت تک کے لئے نظر بند کر دیا اور مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند اور ان کے ساتھیوں پر جو حج کرنے مکہ گئے ہوئے تھے شریف مکہ کی مدد سے نگرانی قائم کر دی۔ اور بعد میں انہیں مالٹا میں نظر بند کر دیا ان پر حکومت کو یہ شبہ تھا کہ ترکی ایران اور افغانستان کے اتحاد سے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہے ہیں۔ ع ۵

حکومت کی ان کارروائیوں سے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا اور اسی کے اثر سے مسلم لیگ کے اندر آزاد خیال گروہ کا اثر بڑھا اور ان میں اور قدامت پسندوں میں پھوٹ پڑ گئی۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں مسلم لیگ کا جو اجلاس مسٹر مظہر الحق کی زیر صدارت بمبئی میں ہوا تھا وہ مسلمانوں کے اس آپس کے اختلاف کا عینی شاہد ہے۔ اس اجلاس میں جو کانگرس کے سالانہ اجلاس کے زمانہ ہی میں منعقد ہوا تھا مسلمانوں کی ان

ع ۵ محمد میاں صاحب ناظم جمعیۃ العلماء صوبہ آگرہ نے اپنی کتاب "علماء کی شاندار ماضی" حصہ پنجم صفحہ ۱۲۱ میں اس شبہ کی صحت کا اقرار کیا ہے اور قیام حجاز کے دوران میں مولانا محمود حسن اور ترکی لیڈر انور پاشا اور جمال پاشا کی ملاقاتوں کا حال اور ان منصوبوں کی تفصیل بھی لکھی ہے جو وہاں آپس میں طے ہوئے تھے اور انور پاشا کے کسی خریطہ کا بھی ذکر کیا جو مولانا محمود حسن نے اپنے کسی شاگرد کے ذریعہ سرحد بھیجا تھا۔ یہ سارا بیان بہت دلچسپ ہے اس حیثیت سے نہیں کہ سیاسیات ہند کا یہ کوئی ہنگامہ خیز واقعہ تھا بلکہ اس اعتبار سے کہ اس سے مولانا محمود حسن جیسے خالص مذہبی بزرگ کی سیاسی سرگرمیوں پر ایک نئے "زاویئے" سے روشنی پڑتی ہے اور یہ بات سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ملکوں کے انقلاب میں مذہبی جماعتیں کس طرح کام کیا کرتی ہیں (مولف)

پارٹیوں میں فساد ہو گیا اور یہ فساد ایسا شدید تھا کہ مسلم لیگ کے صدر کو فی الفور جلسہ ختم کر دینا پڑا۔ اس موقع پر باعث اختلاف و فساد صرف یہ خیال تھا کہ لیگ اور کانگرس کا سمجھوتہ جس کی آزاد خیال حضرات کوشش کر رہے ہیں مسلمانوں کے قومی اور سیاسی مفاد کے خلاف ثابت ہوگا۔ چنانچہ اجلاس میں ہنگامہ کیا گیا یہ ظاہر کرنے کو کہ عام مسلمان اس طبقہ کے ساتھ نہیں ہیں جو کانگرس سے مصالحت کرنی چاہتا ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ہنگامہ پڑھے لکھے مسلمانوں کی طرف سے نہیں ہوا تھا بلکہ چند ناسمجھ مسلمانوں کا یہ کام تھا جو لیگ کو سیاسی نہیں بلکہ مذہبی روپ میں دیکھنا پسند کرتے تھے اور جنہیں اپنے سیاسی نظریوں سے زیادہ اپنے مذہبی توہمات سے عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس ہنگامہ کا اثر بالکل وقتی رہا اور پڑھے لکھے طبقہ نے اسکا مطلق خیال نہ کیا۔

لیگ کی پالیسی ہندو مسلم سمجھوتے کے متعلق وہی قائم رہی اور کانگرس نے بھی اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ایک کمیٹی بنا ڈالی جس نے پوری دلچسپی سے ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔

اسوقت ملک کی سیاسی صورت حال یہ تھی کہ حکومت کی طرف سے ۱۹۱۶ء میں اصلاحات کی دوسری قسط ہندوستان کو ملنے والی تھی اور اس موقع پر کانگرس ملک میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی جدوجہد کر رہی تھی لیکن سیاسی اقتدار اسوقت تک حاصل نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ ہندوستان کی دوسری جماعتوں سے سیاسی مفاہمت نہ کرے۔ دوسری طرف مسلمانوں کو بھی مجوزہ اصلاحات کے معاملہ میں گھاٹے میں رہنا منظور نہیں تھا اور چونکہ حکومت پر ان کا اثر اسوقت تک نہیں پڑ سکتا تھا جب تک ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعت سے سمجھوتہ نہ ہو جائے اسلئے مسلمانوں کے

ذمہ دار حلقوں میں مفاہمت کی سچی خواہش پیدا ہو گئی تھی جس نے ملک میں ہندو مسلم سمجھوتے کے لئے سازگار فضا پیدا کر دی تھی۔ ایسے وقت میں مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کی نظریں مسٹر محمد علی جناح پر پڑیں کیونکہ اسوقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے سیاسی اختلافات کو صحیح طور پہ سمجھنے اور طے کرنے کی صلاحیت مسٹر محمد علی جناح سے بہتر کسی لیڈر میں نظر نہ آتی تھی۔ چنانچہ محمد علی جناح نے یہ اہم اور نازک ذمہ داری قبول کر لی اور ایک کمیٹی کے ذریعہ ایک ایسی اسکیم تیار کر لی جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کی سیاسی مفاہمت ہو سکتی تھی۔

نومبر ۱۹۱۶ء میں کلکتہ میں سر سریندر ناتھ بنرجی کی زیر صدارت لیگ اور کانگریس کا ایک مشترکہ اجلاس ہوا جس میں مسٹر محمد علی جناح کی اسکیم کی روشنی میں وہ میثاق مرتب کیا گیا جسے "لکھنؤ پیکٹ" یا میثاق لکھنؤ کہتے ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس لکھنؤ نے جس کی صدارت خود مسٹر محمد علی جناح نے کی تھی ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو اور آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس نے مسٹر امبکا چرن موزمدار کی صدارت میں ۲۶ دسمبر ۱۹۱۶ء کو اس میثاق کی تصدیق کر دی۔

اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح نے جو خطبہ دیا وہ چونکہ مسلمانوں کے سیاسی زاویہ نگاہ کا پوری طرح ترجمان ہے اور ۱۹۱۶ء کی طرح آج بھی یہ مسلم سیاست کی پوری پوری تفسیر کرتا ہے۔ اس لئے اس کے بعض اقتباسات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مسٹر محمد علی جناح نے حکومت خود اختیاری پر بحث کرتے ہوئے فرمایا :۔

"آج سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیا ہندوستان آزاد ہونے کے قابل ہے؟ اور اگر ہے تو کس حد تک؟ اس سلسلہ میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں اس سوال کو ایک قطعی صورت میں فیصل ہو جانا چاہئے اگر وہ آج اس قابل نہیں ہے تو اس میں حکومت برطانیہ بھی اتنی ہی قصوروار ہے

جتنے ہندوستانی (محمد علی جناح مصنفہ سروجنی نائیڈو صنم)
اور اس بارے میں ہندوستانیوں کے عزم وارادے کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔
"ہم یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ برطانوی حکومت پر ثابت کر دیں گے کہ ہم برطانوی سلطنت میں ایک مساوی شریک کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہندوستان اس سے کم پر مطمئن نہ ہوگا"
مسلم لیگ کے قیام، مقاصد اور کانگریس کے ساتھ اس کے اشتراک عمل کی نوعیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔
"ہندو سیاسیئین کے اصلاحات کے پُر زور مطالبات ہی نے مسلمانوں کو جگایا اور اپنی تنظیم کی ضرورت محسوس کرائی۔ کیونکہ اندیشہ تھا کہ کہیں یہ اصلاحات مسلم قوم کے وجود ہی کو محو نہ کر دیں۔
لیگ کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی علحدہ قومیت اسقدر مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے کہ کسی قسم کی سیاسی اصلاحات اسے نقصان نہ پہونچا سکیں اسی مسلک نے دراصل مسلمانوں کے افکار و آراء میں وسعت پیدا کی اور سیاست سے انہیں دلچسپی دلائی۔ ہندوؤں سے مستقبل کے بارے میں لیگ کا یہ نقطہ نظر ہے کہ لیگ ملک کی عام ترقی کے لئے ان کانگریسی تحریکوں کی تائید کرے گی جن کی بنیاد حبِ وطن پر ہوگی"
مسلمانوں پر فرقہ پرستی کا جو الزام ہندو بھائیوں کی طرف سے لگایا جاتا تھا اس کا جواب دیتے ہوئے کہا:-
"میں اپنی پبلک زندگی میں ہمیشہ پکا کانگریسی رہا ہوں اور فرقہ وار شور و غل کو میں نے کبھی پسند نہیں کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ڈیڑھ اینٹ

کی مسجد الگ بنانے کا جو الزام مسلمانوں کے سر تھوپا جا رہا ہے وہ نہایت نامناسب اور غیر متعلق ہے جبکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ عظیم الشان قومی نظام سرعت کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی پیدائش کا ایک طاقتور آلہ بنتا جاتا ہے ایک قلیل التعداد جماعت کے لئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کو اپنی حفاظت کا کامل اطمینان ہو، قبل اس کے کہ قومی کاموں میں اس کے وسیع تر سیاسی احساس کو باہمی امداد اور متحدہ کوشش پر آمادہ کیا جاوے مسلمانوں کو یہ طمانیت بہ حیثیت ایک جماعت کے اپنی سیاسی ہستی کے کامل اور موثر تحفظ ہی کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے"

(محمد علی جناح مصنفہ سروجنی نائیڈو ص۶۸)

اس اجلاس میں وہ مشترکہ اسکیم بھی پیش کی گئی جسے لیگ اور کانگرس کی مشترکہ کمیٹی نے مسٹر محمد علی جناح کی رہنمائی میں مرتب کیا تھا۔ یہ اسکیم پانچ حصوں میں منقسم تھی اور ان حصوں میں ملکی نظم ونسق کے ہر شعبہ پر رائے پیش کی گئی تھی۔ ذیل میں نہایت اختصار کے ساتھ یہ اسکیم درج کی جاتی ہے۔

حصہ اول۔ اس میں صوبجاتی مقننہ کی تشکیل اور اس کے وظائف سے بحث کی گئی تھی۔ ہر بڑے صوبہ کی مقننہ میں ۱۰۰ سے ۱۲۵ تک ارکان ہونے چاہئیں اور چھوٹے صوبوں کی مقننہ میں ۵۰ سے لیکر ۷۵ تک کی تعداد کافی ہو گی۔ ہر صورت میں ۴/۵ تعداد ارکان کی نہایت وسیع رائے دہندگی کے اصول پر منتخب ہو گی۔ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ہر صوبہ کی مقننہ میں نشستیں محفوظ رکھی جائینگی۔

پنجاب میں ۵۰ فیصدی۔ یو پی میں ۳۰ فیصدی۔ بنگال میں ۴۰ فیصدی

بہار میں ۲۹ فیصدی۔ سی پی میں ۱۵ فیصدی۔ مدراس میں ۱۵ فیصدی۔ اور بمبئی میں ۲۳ فیصدی نشستیں مسلمانوں کے لئے محفوظ ہوں گی۔ اگر کسی اقلیت کے ۳/۴ منتخب شدہ ارکان کسی تجویز کی اپنے مفاد کے پیش نظر مخالفت کریں تو اس تجویز کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ ان صوبجاتی مجالس کے صدر منتخب شدہ ہوں گے۔ صوبجاتی مجالس مقننہ اپنی ذمہ داری پر قرض لینے اور محصولات میں تغیر و تبدل کی مجاز ہو گی میزانیہ مجلس کی رائے سے منظور ہوگا۔ مجلس کی تمام تجاویز عاملہ کے لئے واجب التعمیل ہوں گی۔

حصہ دوم۔ ہر صوبہ کا گورنر یا لفٹنٹ گورنر غیر سولین ہونا چاہیے اسکی مجلس عاملہ میں نصف ارکان ہندوستانی ہونے چاہئیں جو مقننہ کے منتخب شدہ ارکان میں سے ہوں گے ان کی میعاد عہدہ پانچ سال ہوگی۔

"حصہ سوم۔ مرکزی مجلس مقننہ ۱۵۰ ارکان پر مشتمل ہوگی اور اس کے ارکان کا انتخاب صوبجاتی مقننہ کے ارکان کریں گے اس کا صدر منتخب شدہ ہوگا اس میں وہ مسائل پیش ہوا کریں گے جنکا تعلق تمام ہندوستان سے ہوگا۔

حصہ چہارم۔ گورنر جنرل کی مجلس عاملہ میں نصف ارکان ہندوستانی ہوں گے حتیٰ المقدور سول سروس کے ارکان کا مجلس عاملہ کے عہدوں پر تقرر نہیں کیا جائیگا۔

حصہ پنجم۔ اس میں وزیر ہند اور اس کی کونسل کے متعلق سفارشات تھیں اور توقع ظاہر کی گئی تھی کہ وزیر ہند حتیٰ الامکان حکومت ہند کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ (تاریخ دستور حکومت ہند ص۱۰۳)

یہ تھی وہ مشترکہ اسکیم جسے لیگ اور کانگرس نے مل کر مرتب کیا تھا جو بعد میں "میثاق

لکھنو" کہلائی۔ اسی میثاق سے مسلم سیاست میں نئی روح آگئی اور مسلم لیگ جو ہندؤں کی نظروں میں اسوقت تک ایک محدود النظر فرقہ پرست جماعت تھی ملک کی مقتدر سیاسی جماعت سمجھی جانے لگی۔

پانچواں باب (۵)

لیگ اور کانگرس کا متحدہ محاذ جنگ

میثاق لکھنؤ سے ہندوستان کی فرقہ وار فضا کسی قدر صاف ہوچکی تھی، اور ملک ملنے والی اصلاحات کے لئے نئے سر سے جدوجہد کی تیاریاں کرنے لگا تھا۔ مسز اینی بسنٹ کی ہوم رول لیگ کا شباب تھا کانگرس کے اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں اس میں شامل ہوگئے تھے اور ملک کے کونے کونے میں ہوم رول کا پرچار ہونے لگا تھا۔ سیاسی تحریکوں میں اسوقت تک عورتیں شامل نہیں ہوئی تھیں سب سے پہلے ہوم رول کی حمایت میں عورتوں کے جلوس نکلے اور مندروں میں پرارتھنا کرنے کا رواج پڑا۔

حکومت اس نئی تحریک کے بڑھتے ہوئے اثرات سے بہت دنوں بے خبر نہیں رہی ابتداءً تو اس نے طرح دی لیکن اس کے بعد وہ تشدد پر اتر آئی۔ ہوم رول کے سارے لیڈر مسز اینی بسنٹ سمیت نظر بند کردئے گئے اور ہوم رول کے جلسوں پر سخت پابندیاں عاید کردی گئیں ان نظر بندیوں سے عوام میں بےچینی بڑھی اور بعض مقامات پر پولس اور ایجیٹروں میں فساد بھی ہوگیا لیکن اس ایجیٹیشن کی شدت زیادہ تر جنوبی ہند میں تھی، شمالی ہند میں اس کا اثر بہت کم تھا اور عام مسلمانوں کی حیثیت اس ایجیٹیشن کے دوران میں ایک تماشائی کی سی رہی اور ان کی ساری ہمدردیاں اپنے ہم وطن

بھائیوں کے ساتھ تھیں۔

ہیجان اس تحریک سے ان میں بھی پیدا ہو گیا تھا لیکن ابھی کوئی اہم تحریک ایسی پیدا نہیں ہوئی تھی جس میں مسلمان بھی ہندوؤں کے دوش بدوش حصہ لیتے البتہ زمین برابر ہموار کی جارہی تھی اور ان مسلم لیڈروں کی رہائی کا انتظار کیا جارہا تھا۔ جنہیں حکومت نے ڈفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت نظر بند کر رکھا تھا۔

میثاق لکھنو پر لیگ اور کانگرس کی مہر تصدیق تو ثبت ہو چکی تھی اور ملک کے ذمہ وار حلقوں میں یہ معاہدہ ہندو مسلم مصالحت کا سنگ بنیاد سمجھا جارہا تھا لیکن ہندو مہاسبھا نے ابھی اس کی توثیق نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں نے بہ حیثیت جماعت اسے تسلیم کیا تھا۔ بلکہ ہندوؤں کے حلقوں میں اس معاہدے پر نہایت سخت غم و غصہ کا اظہار کیا جارہا تھا اور اس کو ہندوؤں کے مفاد کے خلاف قرار دیتے ہوئے ان ہندو لیڈروں پر سختی سے نکتہ چینی کی جارہی تھی جنہوں نے اس معاہدہ کو منظور کر لیا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ ایسا تھا جو اس میثاق کو مسلمانوں کے قومی مفاد کے منافی سمجھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔ طرفین کے ان مخالفانہ خیالات کے باوجود مسٹر محمد علی جناح کی تجویز پر لیگ اور کانگرس کی مشترکہ کمیٹی بن گئی جس نے مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں ہندوستانیوں کے لئے ایک مشترکہ اسکیم تیار کرنی شروع کر دی۔

ابھی یہ اسکیم تیار ہو ہی رہی تھی کہ اعظم گڑھ کے علاقہ میں گائے کی قربانی کے سلسلہ میں بڑا زبردست ہندو مسلم فساد ہوا، ۲۵ ہزار ہندو اس علاقے کے مسلمانوں پر چڑھ آئے جس سے مسلمانوں کی جان و مال کو شدید نقصان پہونچا۔ عین اس وقت جبکہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد کی کوشش ہو رہی تھی اس ناگوار واقعہ کا پیش آنا انتہائی

افسوسناک بات تھی چنانچہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ اس فساد سے کہیں پھر دونوں قوموں کے تعلقات میں کشیدگی نہ پیدا ہو جائے لیکن ملک کی فضا چونکہ اسوقت فرقہ وار تکدر سے پاک تھی اس واقعہ کا عام طور پر چرچا نہیں ہوا اور اس کے ناگوار اثرات مقامی حدود سے آگے بڑھنے نہیں پائے۔ تاہم اس واقعہ سے مسلمانوں کا ایک طبقہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور اس نے علانیہ ہندوؤں کو اس واقعہ کا ملزم گردانتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ ہندو اسقدر متعصب اور سنگدل واقع ہوئے ہیں کہ ملکی معاملات میں بھی وہ اب مسلمانوں کے ساتھ ملکر کام کرنا نہیں چاہتے۔

مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں پر یہ الزام واقعہ یہ ہے کہ بے وجہ نہیں تھا، ایک تو متعصب ہندوؤں کی یہ روش تھی ہی قابل الزام جو بہار میں ہندو مسلم فساد کا باعث ہوئی تھی، دوسرے ملک کے سمجھدار ہندو افراد نے اس واقعہ پر جیسی سنگین خاموشی اختیار کر رکھی تھی وہ مسلمانوں کو عام ہندوؤں کی نیتوں کے بارے میں مشتبہ کر دینے کو کافی تھی۔

لیکن اس بدگمانی اور بداعتمادی کے باوجود جو ہندو مسلمانوں کے ایک مخصوص حلقے میں ایک دوسرے کے متعلق پائی جاتی تھی، لیگ اور کانگرس کے نئے رشتے پر کوئی اثر نہیں پڑا لیگ اور کانگرس کی مشترکہ کمیٹی نے اپنا کام پورا کر لیا اور کانگرس اور لیگ ہی کے ایک وفد نے یہ اسکیم حکومت کے آگے پیش بھی کر دی چنانچہ حکومت ہند نے ہندوستان میں اپنی اصلاحات کے متعلق حکومت برطانیہ کو جو رپورٹ بھیجی اس میں اس مشترک اسکیم سے بحث کی ہے اور اصلاحات کی سفارشات میں ہندوستانی مطالبات کا لحاظ رکھا ہے۔

البتہ جداگانہ انتخاب کے خلاف بھی ایک اشارہ کر دیا تھا جس کی وجہ سے

مسلمانوں کو شکایت پیدا ہوئی لیکن چونکہ پارلیمنٹ نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا تھا اس لئے مسلمانوں نے حکومت ہند کے اس اشارے پر کوئی اہمیت نہیں دی۔

اصل میں اس سال ہندوستانی مسلمان ایک عجیب قسم کی دماغی الجھن میں گرفتار تھے۔ ایک طرف ملکی سیاست میں حصہ لینے کا جوش انہیں برادران وطن کی صف سے بھی آگے بڑھ جانے پر آمادہ کر رہا تھا دوسری طرف وہ (مسلمان) یہ محسوس کر رہے تھے کہ نجی زندگی میں ہندوؤں کا سخت متعصبانہ رویہ انہیں بری طرح پیچھے کی طرف دھکیل رہا ہے۔ اسی طرح جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا مسلمانوں کی طرف سے زیادہ سے زیادہ حصول اصلاحات کا مطالبہ بھی جاری تھا مگر ساتھ ہی یہ خطرہ بھی برابر لگا ہوا تھا کہ کہیں ان اصلاحات کی بدولت ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت ہی ختم ہو کر نہ رہ جائے۔

گھریلو حالات میں اس ذہنی کشمکش کے ساتھ ساتھ ممالک اسلامیہ کے متعلق حکومت برطانیہ نے جنگ عظیم میں جو رویہ اختیار کیا تھا وہ بھی مسلمانوں کو تکلیف دے رہا تھا۔ عربوں کو ترکوں کے خلاف بھڑکا کر، عربوں اور ترکوں دونوں کی قوت کو توڑ دینے کی جو شاطرانہ چال چلی گئی تھی اس نے مسلمانوں کو سخت بےچین کر رکھا تھا۔ اور کوئی تدبیر ایسی سمجھ میں نہیں آتی تھی جس سے حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال کر اسکی اسلامی پالیسی میں اصلاح کرائی جاتی۔ چند مسلم لیڈروں نے جو اس شاطرانہ چال کو سمجھتے تھے اس کے خلاف آواز اٹھائی بھی تو انہیں بھی حکومت نے نظر بند کر دیا تھا۔

غرض اس سال عام مسلمانوں میں اسی قسم کا دماغی انتشار پایا جاتا تھا اور اسی الجھن کے ساتھ وہ مسلم لیگ کے ۱۹۱۷ء کے اجلاس میں بھی شامل ہوئے تھے

اس اجلاس کے صدر تو بالاتفاق مولانا محمد علی مرحوم منتخب ہوئے تھے لیکن وہ نظر بند تھے اور حکومت نے انہیں رہا کرنے سے انکار کر دیا تھا اس لئے اس اجلاس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے فرمائی تھی۔ اپنے خطبہ صدارت میں راجہ صاحب محمود آباد نے مسلمانوں کے شکوک وشبہات پر تفصیل سے گفتگو کی ہے اور بہار کے ناگوار واقعہ پر بھی اظہار افسوس کیا ہے۔ خطبہ صدارت کے علاوہ اس اجلاس میں جو تجاویز منظور ہوئیں ان سے بھی اس پر روشنی پڑتی ہے کہ عام مسلمان اسوقت ہندو بھائیوں کے طرز عمل سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوئے تھے اور چاہتے تھے کہ اس حقیقت کو پوری صفائی کے ساتھ ہندو بھائیوں کے گوش گذار کر دیں۔ چنانچہ اس سال جو قرار دادیں لیگ کے اجلاس میں منظور ہوئیں ان میں پانچویں اور دسویں قرار دادوں کے الفاظ یہ تھے:۔

"(۵) ــــ مسلم لیگ گذشتہ بقر عید اور محرم کے موقعوں پر بہار میں ہندوؤں کے متعصبانہ مظاہروں کو خطرے کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور فسادیوں کے طرز عمل پر اظہار ملامت کرتی ہے اور جو لوگ کہ پس پردہ ان کی اعانت کر رہے ہیں انہیں ملک کا دشمن تصور کرتی ہے۔

اسی کے ساتھ یہ اجلاس بہار کے واقعات پر ذمہ دار ہندو رہناؤں کی خاموشی پر شدید رنج کا اظہار کرتا ہے"

(۱۰) ــــ جن صوبجات کی عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اُردو زبان اور فارسی رسم الخط رائج ہے وہاں اسے جاری رکھا جائے اور ان صوبجات میں ابتدائی ذریعہ تعلیم بھی اردو کو قرار دیا جائے۔

ان قرار دادوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ لیگ کے رہناؤں نے بہار کے

فساد کو کس نظر سے دیکھا تھا۔ اگرچہ انہوں نے اس واقعہ کو بالکل ہی فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کیا ہے لیکن اپنے اس رنج کو نہیں چھپا سکے جو انہیں اس موقع پر ذمہ دار ہندو رہناؤں کی خاموشی سے پہونچا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ لیگ اور کانگرس میں نیا رشتہ قائم ہوا تھا اور اسی کو وجہ بنا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی جا رہی تھی ذمہ دار ہندو رہناؤں کا یہ اخلاقی فرض تھا کہ وہ اس واقعہ پر اپنی سخت ناراضی کا اظہار کر کے مسلمانوں کے دل سے شبہات کو دور اور ان کے رنج کو ہلکا کرتے۔ بجائے اس کے انہوں نے خاموشی اختیار کر کے ان مسلمانوں کو ہندوؤں سے اور زیادہ برگشتہ ہونے کا موقع دیدیا جو لیگ اور کانگرس اور اس کے بعد ہندو مسلم سمجھوتے ہی کے خلاف تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف اگر کوئی خاص رائے قائم کر لی تھی تو وہ غلطی پر نہیں تھے۔

لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے اس متعصبانہ ذہنیت کے مظاہرے کے باوجود مسلمانوں نے سیاست میں جو قدم بڑھایا تھا وہ پیچھے نہیں ہٹایا اور نہ اپنی طرف سے اس معاہدے سے پھرے جو لیگ اور کانگرس کے درمیان لکھنؤ میں طے ہو چکا تھا۔ البتہ ہندو بھائی اس معاہدے سے خوش نہ تھے اور برابر یہ کوشش کر رہے تھے کہ یہ کسی طرح کالعدم ہو جائے۔ چنانچہ ہندو مہاسبھا نے نہ صرف اس معاہدہ کا اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ اپنے پچھلے اجلاس میں اس پر بڑی شدت سے نکتہ چینی کی اور اسے سراسر ہندو مفاد کے خلاف بتایا۔ جس کے بعد ظاہر ہے کہ عام ہندوؤں میں اسکا مقبولیت حاصل کرنا ناممکن ہو گیا۔ بلکہ اس معاہدے پر ہندو مہاسبھا کے ذمہ دار لیڈروں کی اشتعال انگیز تقریروں کا اثر

یہ ہوا کہ متعصب ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے اور ان مقامات پر جہاں مسلمان بہت کمزور تھے انہوں نے بے تکلف مسلمانوں کو دبانا شروع کر دیا۔ اس ذہنیت کا نتیجہ بھی اسی سال نکل آیا۔ کٹار پور (اودھ) میں ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک زبردست فساد ہوا جس میں ہندوؤں نے تین مسلمانوں کو زندہ جلا دیا۔ یہ واقعہ ایسا نہیں تھا کہ مسلمانوں کو متاثر نہ کرتا عام مسلمانوں پر اس کا اثر ہوا اور بہت ہوا خصوصاً اس لئے یہ اثر اور زیادہ ہوا کہ ہندو رہناؤں نے اس واقعہ کے بعد بھی حسب عادت اپنے منہ پر قفل لگائے رکھا۔

اسی سال یعنی دسمبر ۱۹۱۸ء میں لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو مسٹر فضل حق کی زیر صدارت دہلی میں ہوا تھا ڈاکٹر انصاری صدر استقبالیہ کی حیثیت سے اپنے خطبہ میں اس واقعہ کے متعلق فرماتے ہیں :—

"بیجا نہ ہوگا اگر اس جگہ کٹار پور کے اندوہناک واقعات کا ذکر کیا جائے جہاں ہندوؤں نے بے قصور اور صلح جو مسلمانوں کے ساتھ بغیر کسی اشتعال کے وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ ان ہولناک واقعات کو پڑھکر مجھے جو صدمہ ہوا ہے وہ بیان سے باہر ہے ناراضگی اور غصہ کے جو جذبات ہم سب کے دلوں میں ہیں ان کا اظہار کرنے سے الفاظ قاصر ہیں اس قسم کے واقعات دونوں قوموں کے تعلقات کو خراب کرتے ہیں اور اس باہمی اتحاد کی بنیاد پر تیشہ چلاتے ہیں جس کے ہم سب آرزومند ہیں۔ میں اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ ایسی موثر تدابیر اختیار کریں کہ آئندہ اس قسم کے واقعات کا ہمیشہ کے لئے سدباب ہو جائے۔ حالات کے ہر پہلو پر نظر کرنے کے بعد میرا یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کے لئے یہ ضروری ہے

کہ اپنا سیاسی مطمح نظر حاصل کرنے کے لئے ہندوؤں کے ساتھ ملکر کام کریں تو یقیناً ہندو بھی مسلمانوں سے جدا رہ کر اپنی منزل مقصود تک نہیں پہونچ سکتے۔ رواداری نہ کہ انتقام ہم دونوں کا مطمح نظر ہونا چاہیئے“ (سیاست وطنی ص۵۵)

ڈاکٹر انصاری کے اس بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف عوام بلکہ وہ آزاد خیال مسلمان بھی جو ملکی معاملات میں ہندوؤں کے دوش بدوش کام کرنا چاہتے تھے ہندوؤں کے رویہ سے مطمئن نہیں تھے اور اس کو بھی خوب سمجھتے تھے کہ ملک کی فضا کو بگاڑنے کی کوشش مسلمانوں کی طرف سے نہیں بلکہ متواتر ہندوؤں کی طرف سے ہوتی رہی ہے۔

۱۹۱۸ء کے آخر میں جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی، اسٹریا اور جرمنی کے ساتھ ترکی کو بھی شکست ہوئی اور سب سے زیادہ اسی پر تباہی آئی۔ عرب، عراق، شام و فلسطین کو ترکی سلطنت سے توڑ لیا، یورپ میں تھریس کا سارا علاقہ چھین لیا قسطنطنیہ پر اتحادیوں نے فوجی قبضہ کر لیا، اور برائے نام اناطولیہ کا برباد علاقہ ترکی کے لئے چھوڑ دیا اب صلح کی گفتگو شروع ہوئی لیکن یہ صلح کی گفتگو نہیں تھی فتحمند قوتوں کا فیصلہ تھا جو ترکی کو سنانے کے لئے پیرس میں مرتب کیا جا رہا تھا ہندوستانی مسلمان اس واقعہ سے بہت متاثر تھے۔ اور انہیں یہ اندیشہ تھا کہ کہیں برطانیہ ترکی میں خلافت ہی کو ختم نہ کر ڈالے۔ لیگ کے گیارہویں اجلاس میں جس میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے ”علماء“ بھی شامل ہوئے تھے اگرچہ چند قرار دادیں ضرور منظور ہوئی تھیں جن میں ترکی کے حصہ بخرے کرنے کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا اور حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ صلح کی گفتگو میں خلیفہ ترکی کا احترام

ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن اس قسم کی قرار دادوں سے فاتحین کے جوش وخروش کو نہیں روکا جاسکتا تھا۔ ضرورت اس بات کی محسوس ہوئی کہ ہندوستانی مسلمان اپنے اس "قومی اور مذہبی" مطالبہ کو زیادہ قوت اور زور کے ساتھ حکومت برطانیہ کے آگے پیش کریں۔ اس مقصد کے لئے زمین ہموار کی جانے لگی، علماء اور مذہبی مسلمانوں نے جگہ جگہ احتجاجی جلسے کرنے شروع کئے اور مسلمانوں میں ترکی اور خلافت کے متعلق بیداری پیدا کی جانے لگی۔

چھٹا باب (۶)

خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کا قیام

جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ایک طرف ترکوں کے لئے مسلمانوں میں بےچینی بڑھی دوسری طرف ہندوؤں کے انتہا پسند گروہ نے سر اٹھایا، خصوصاً پنجاب میں حکومت کے خلاف سازشوں کا زور ہوا۔ حکومت نے اس زور کو توڑنے کے لئے "رولٹ ایکٹ" نافذ کر دیا۔ یہ قانون مارشل لا کا ہم معنی اور شہری آزادی کے قطعاً منافی تھا۔ اس کا نافذ ہونا تھا کہ ملک کے طول و عرض میں ایک آگ سی لگ گئی ہر جگہ اس قانون کے خلاف احتجاجی جلسے ہوئے، گاندھی جی نے اس سے مقابلہ کے لئے "ستیہ گرہ" کی بنیاد ڈالی اور ایسی سرفروش جماعت تیار کرنے میں مصروف ہو گئے جو رولٹ ایکٹ کی جگہ جگہ خلاف ورزی کر کے اسے بے اثر بنا دے۔ اس موقع پر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندو مسلم اختلافات مٹ گئے اور دونوں قومیں حکومت کے اس جبر و تشدد کی پالیسی کے خلاف متحد ہو گئیں۔

رولٹ ایکٹ کے مقابلہ میں ستیہ گرہ شروع ہوا، کہیں ستیہ گرہ کرنے والوں پر پولس کے ڈنڈے پڑے اور کہیں انہیں گولیاں کھانی پڑیں۔ امرتسر میں سب سے زیادہ سخت حادثہ پیش آیا۔ پنجاب میں دہشت انگیزی کی بڑھتی ہوئی رفتار کو

روکنے کے لئے سرمائیکل اوڈوائر گورنر پنجاب نے سارے علاقہ میں مارشل لا نافذ کر رکھا تھا اور سیاسی جلسے منعقد کرنے کی سختی سے ممانعت کر دی تھی۔ لیکن رام نومی کی تقریب سے فائدہ اٹھا کر گورنر کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے امرتسر کے جلیانوالے باغ میں ایک جلسہ عام کا اعلان کر دیا گیا۔ جلسہ ہوا لیکن اس طرح کہ ابھی شروع ہی ہوا تھا کہ جنرل ڈائر ہندوستانی اور انگریزی فوج کا دستہ لیکر جلیانوالے باغ پہونچ گیا اور صدر کا راستہ روک کر مجمع کو منتشر کرنے کے لئے گولیاں چلا دیں جس کے باعث ۳۷۹ ہندوستانی شہید اور ۱۲۰۸ ہندوستانی زخمی ہو گئے اس واقعہ نے ہندوستانیوں کو سخت مشتعل کر دیا اور حکومت کے خلاف انکی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں۔

دوسری طرف مسئلہ خلافت کی وجہ سے مسلمانوں میں انگریز حکومت کے خلاف ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ مسلمانوں کے انتہا پسند مفکرین نے عام مسلمانوں کے اس ہیجان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۱۹ء کے آخر میں "خلافت کمیٹی" کے نام سے ایک نئی جماعت قائم کر ڈالی جسکا مقصد یہ قرار دیا کہ "حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال کر مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر یورپین اقوام کا قبضہ نہ ہونے دے" ظاہر ہے کہ یہ خالص اسلامی تحریک تھی لیکن گاندھی جی نے جواب کانگریس کے مسلمہ لیڈر سمجھے جاتے تھے اس تحریک کی تائید کی اور دسمبر میں کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ہی اس کا بھی پہلا اجلاس امرتسر میں کرنا تجویز کر دیا۔

خلافت کمیٹی کے علاوہ اس سال مسلمانوں کی ایک اور نئی جماعت عالم وجود میں آئی یہ علماء کی جماعت تھی "جمعیۃ العلماء ہند" اس کا نام تجویز ہوا اور اس کا مقصد "تحفظ ملت اور سیاسیات میں مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی" متعین کیا گیا۔ اس کا اجلاس بھی کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کانفرنس کے ساتھ

امرتسر ہی میں ہونا قرار پایا۔

ان دو نئی جماعتوں کے قیام کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی تین سیاسی جماعتیں ہوگئیں اگرچہ ابتداءً منزل مقصود سب کی بظاہر ایک ہی معلوم ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ یہ "دورِ تثلیث" مسلمانوں میں تفرقہ ڈالنے لگا، اور ان کی قوتیں بٹنی شروع ہوگئیں۔ انتشار میں مرکزیت کا خیال کیونکر آسکتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم سیاست جو اسوقت تک ایک خاص نہج سے نشوونما پارہی تھی اس کشمکش میں بے نتیجہ پریشان خیالی کا مجموعہ بن کر رہ گئی۔

لیکن یہ صورت کچھ عرصہ بعد کی ہے، ابتدا تو جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے ان دونوں اسلامی جماعتوں کی نہایت شاندار ہوئی۔ مسلمانوں نے نہایت گرمجوشی سے انہیں لبیک کہا اور پوری سرگرمی سے ان کا ساتھ دیا۔ امرتسر کا اجتماع جلیانوالے باغ کے حادثہ کے بعد ویسے ہی کیا کم پُرجوش تھا، ان نئی اسلامی جماعتوں کی شمولیت نے اُسے دوآتشہ کردیا۔

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی ابھی دونوں بیتول جیل سے رہا ہوئے تھے، اسیدھے امرتسر پہونچے اور پوری ذمہ واری کے ساتھ تحریک خلافت کو اپنے چارج میں لے لیا۔ جمعیۃ العلماءِ ہند کے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی تھے اور مسلم لیگ کی صدارت حکیم اجمل خاں نے فرمائی تھی۔ جوش وخروش کا ایک طوفان تھا جو ہر طرف سے امنڈ رہا تھا، ہندو مسلم تفریق مٹ چکی تھی، اور حکومت برطانیہ کی مخالفت پر ان دونوں کا اتحاد ہوگیا تھا۔ مسلمانوں کو سب سے زیادہ غصہ برطانیہ کی اس حرکت پر آرہا تھا کہ اس نے سلطنت ترکی کے ٹکڑے اڑا دیئے تھے اور مسلمانوں کی واحد اسلامی سلطنت کو یورپ

نکال باہر کیا تھا۔ اسی کے ساتھ ہندوستان میں حکومت کا تشدد بھی ان کیلئے
باعث اشتعال بن گیا تھا انہی ملے جلے جذبات نے مسلمانوں کو بے قابو کر دیا
تھا اور وہ حکومت سے ٹکرانے پر آمادہ نظر آنے لگے تھے۔ حکومت سے ترک
معاون کا خیال بھی پہلے پہل اسی اجتماع میں پیدا ہوا اور سول نافرمانی کا خاکہ بھی
یہیں تیار کیا گیا۔ اور اس طرح حکومت برطانیہ کے خلاف ہندوستان میں ہندو
مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ تیار ہونے لگا +

ساتواں باب (۷)

تحریک خلافت، تحریک مقاطعہ اور متحدہ جنگ کا آغاز

۱۹۲۷ء میں حکومت کی طرف سے ہندوستان کے لیے جدید اصلاحات کا اعلان ہونے والا تھا اور ان اصلاحات کو امرتسر کانگریس نے غیر تسلی بخش اور مایوس کن قرار دیکر انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن یہ فیصلہ کانگریس کے انتہا پسندوں کا تھا جن کی امرتسر میں اکثریت تھی ہندوں کا اعتدال پسند طبقہ اس فیصلہ سے متفق نہ تھا چنانچہ اس نے کانگریس سے علحدہ ہوکر "لبرل فیڈریشن" کے نام سے اپنی ایک علحدہ جماعت بنالی تھی اور جدید اصلاحات کو قبول کر لینے کا اعلان کر دیا تھا۔ البتہ مسلم جماعتیں اس معاملہ میں پوری طرح کانگریس کے ساتھ رہیں اور جدید اصلاحات سے انہوں نے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ اس وقت مسلمانوں کو سب سے زیادہ سلطنت ترکی کی تباہی کا خیال ستا رہا تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ پیرس کی صلح کانفرنس میں برطانیہ اپنے ان وعدوں کا خیال رکھے جو اس نے جنگ سے پہلے اسلامی ممالک سے کئے تھے اور ترکی کے حصے بخرے کرکے مسلمانوں کی قوت کو نہ توڑے۔ چنانچہ جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں مسلم لیڈروں کا ایک وفد ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے کی خدمت میں بھیجا گیا اور اس نے یہ بات اچھی طرح وائسرائے

کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ ترکی سلطنت کو برقرار اور ترکی سلطان کو بہ حیثیت خلیفۃ المسلمین بحال رکھنا ضروری ہے اس لئے کہ اسلامی عقیدے کے مطابق خلیفہ کی روحانی اور دنیوی طاقت ہمیشہ قائم و برقرار رہنا لازمی ہے۔ لیکن وائسرائے نے اس وفد کو جو جواب دیا اس سے مسلمانوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ حکومت کی اس سرد مہری سے متاثر ہو کر مسلم لیڈروں نے ایک اعلان شائع کیا ہے جس میں حکومت کے رویہ پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو یہ دھمکی دی تھی کہ "ترکی سے صلح کی شرائط مسلمانوں کے مذہب اور جذبات کے ناموافق ہوئیں تو مسلمانوں کے لئے حکومت برطانیہ کا وفادار رہنا مشکل ہو جائیگا۔"

وائسرائے کے جواب سے مایوس ہو کر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں خلافت کا ایک وفد مولانا محمد علی کی قیادت میں انگلستان بھیجا گیا، لیکن وہاں بھی اس وفد کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات بے انتہا مشتعل ہو گئے اور انہوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں برطانیہ سے ترک تعلق کرنیکا ارادہ کر لیا۔

گاندھی جی نے جو اسوقت کانگرس کے مسلمہ لیڈر تھے، مسلمانوں کو برطانیہ سے اس درجہ برگشتہ دیکھ کر مسلمانوں کی سرپرستی کی اور تحریک ترک موالات کو جس کا خاکہ امرتسر کے اجتماع میں تیار ہو چکا تھا، عملی جامہ پہنانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن کانگرس کا اعتدال پسند طبقہ اس خیال کے موافق نہ تھا حکومت کے خلاف اسقدر سخت اقدام اس کی رائے میں ہندوستانی مفاد کے خلاف تھا۔ لیکن انتہا پسند طبقہ گاندھی جی کے ساتھ تھا، وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے اس ہیجان سے فائدہ اٹھائے اور حکومت ہند کو ہندو مسلمانوں کی متحدہ طاقت سے اپنے آگے

جھکنے پر مجبور کر دے۔ چنانچہ ترک موالات کی تحریک کی حمایت میں زمین ہموار کرنے کے لئے جگہ جگہ جلسے کیے گئے۔ قومی دن منائے گئے۔ جلوس نکلے، ذمہ دار لیڈروں کی طرف سے بیانات شائع ہوئے اور جب ملک کے عرض و طول میں حکومت کے خلاف کافی ہیجان پیدا ہو گیا تو دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگرس، لیگ، اور خلافت کے مشترک اجلاس ہوئے اور ایک سخت معرکہ کے بعد کانگرس نے ترک موالات کی تجویز منظور کر لی جس کی تائید خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ نے بھی کی۔ اور اس طرح حکومت کے خلاف ہندو مسلمانوں کا متحدہ محاذ تیار کر لیا گیا۔

اس اجلاس سے مسلم سیاست کا رخ بدلتا ہے اور مسلمانوں کی قیادت اعتدال پسندوں کے بجائے مسلمانوں کے انتہا پسند لیڈروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء کے نام سے دو نئی جماعتوں کے قیام کے بعد مسلم سیاست میں مرکزیت تو پہلے ہی غائب ہو چکی تھی ناگپور کے اس فیصلہ سے وہ اتحاد خیال بھی رخصت ہو گیا جو مسلمانوں کی تینوں جماعتوں کو آپس میں ملائے رکھنے کا باعث تھا۔

ترک موالات کی تحریک بعض اعتدال پسند مسلم مفکرین کے نزدیک محض تخریبی تحریک تھی جس سے ہندوستانیوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا تھا بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے جس طرح عوام کے جذبات سے کھیلا جا رہا جا رہا ہے اس کا نتیجہ مستقبل میں کہیں مستقل شر و فساد کا باعث نہ بن جائے۔ اسی کے ساتھ ان مسلم لیڈروں کو یہ بھی اعتراض تھا کہ اس وقت محض جذبات سے مغلوب ہو کر مسلمانوں کو اپنی انفرادیت کے تحفظ کی فکر کئے بغیر ہندوؤں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے کی جو صورت تراشی گئی ہے وہ اصولاً بالکل غلط اور مسلمانوں کو سخت نقصان

پہونچانے والی ہے۔ لیکن وہ زمانہ سیاسی بحران کا تھا، دماغ کے بجائے جذبات کا سکہ رواں تھا، لیڈر اور عوام ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے تھے، ان عقل کی باتوں کو سوچنے کا نہ انہیں ہوش تھا اور نہ انہیں خیال۔ صرف ایک عقیدہ عام تھا کہ کسی طرح حکومت برطانیہ کے غرور کو ٹھوکر لگائی جائے۔ اور اسی عقیدہ پر ہندو مسلم اتحاد ہوا۔ گویا اتحاد کی خاطر اتحاد نہ تھا، ہندوستانی مفاد کے پیش نظر اتحاد نہ تھا، ہندو مسلم اختلافات کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لئے اتحاد نہ تھا، اور نہ اس لئے یہ اتحاد کیا گیا تھا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مشترک حکومت قائم کرنا مقصود تھا بلکہ یہ اتحاد صرف حکومت برطانیہ کی مخالفت پر تھا! ——— یا بہ الفاظ دیگر یہ اجماع حُبِ علی پر نہیں بلکہ بغضِ معاویہ پر ہوا تھا!!

کیونکہ اگر ہندو مسلمانوں میں اتحاد کی خاطر یہ اتحاد ہوتا تو اس اتحاد کی نوعیت ضرور متعین ہوتی۔ اگر ہندوستانی مفاد کے پیش نظر ہوتا تو خالص ہندوستانی نقطہ نظر سے کوئی تعمیری پروگرام مدوّن کیا جاتا۔ اگر ہندو مسلم اختلافات کو مستقل طور پر ختم کرنے کے لئے یہ اتحاد کیا جاتا تو آپس کی ان شکایتوں کو دور کرنے کی کوئی سبیل کی جاتی جن کے باعث مدت سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات میں کشیدگی چلی آرہی تھی اور اگر اس اتحاد کا یہ مقصد ہوتا کہ ہندوستان میں ہندو مسلمانوں کی مشترک حکومت قائم کی جائے تو وہ شرائط زیر بحث آتیں جن کے ماتحت یہ دونوں قومیں مستقبل میں ہندوستان کی وارث قرار پاتیں۔

بہرحال جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں یہ سیاسی بحران کا زمانہ تھا، دلوں پر عقلوں کے بجائے جذبات کی حکومت تھی، لیڈروں کے ساتھ عوام اور عوام کے ساتھ لیڈر نہایت تیزی سے بہے چلے جاتے تھے اور ان میں سے کسی کو بھی یہ پتہ نہیں تھا کہ

کہ ان کی حقیقی منزل مقصود کیا ہے ۱۹۲۲ء کا پورا برس اسی وارفتگی اور خود فراموشی میں گذر جاتا ہے، حکومت کی طرف سے نئی اصلاحات کا نفاذ ہوتا ہے ہندؤں کا ایک بڑا طبقہ ان اصلاحات کو قبول کر لیتا ہے، کانگرس کے بعض سربراہ اور وہ لیڈر بھی حکومت کے وفادار وں کے اس جم غفیر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سر ہندر ناتھ بنرجی، بنگال کے مشہور قوم پرست رہنما حکومت سے "سر" کا خطاب اور نئے آئین میں بنگال کی وزارت قبول فرما لیتے ہیں مسٹر سنہا "لارڈ سنہا" بنکر بہار و اوڑیسہ میں پہلے ہندوستانی گورنر کی حیثیت سے جلوہ افروز ہوتے ہیں مسٹر چنتامنی یوپی میں، سر سی پی راما سوامی آئیر مدراس میں اور لالہ ہرکشن لال پنجاب میں وزارتیں سنبھال لیتے ہیں لیکن مسلمان؟ ان سب "لغویتوں" سے بچے ہوئے حکومت برطانیہ سے ترکی کا "انتقام" لینے میں مصروف رہتے ہیں! اور جو غیر جذباتی، مسلمان اپنے ملک کی "خیر" اپنے "قومی وجود" کی خیر مناتا ہوا اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا بھی اُسے بے تکلف ہدف ملامت بنا دیا۔ اور اس پر اس بری طرح "حکومت پرست" اور "ٹوڈی" کے آوازے کسے کہ عوام مسلمانوں کی نظروں میں وہ غریب لعنتی، بنکر رہ گیا۔

ترک موالات کی تحریک میں، حکومت کی کونسلوں سے بے تعلقی، مطالبات کی واپسی، عدالتوں سکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ بھی شامل تھا، ہندؤں اور مسلمانوں کے انتہا پسند لیڈروں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے کیلئے ملک کے طول و عرض میں دورے کئے، جلسے کئے جلوس نکالے اور ملک بھر میں ایک مرتبہ پھر شدید ہیجان پیدا کر دیا۔ اکثر ہندوستانیوں نے خطابات واپس کر دیئے۔ کئی مقامات پر پنچائتیں قائم ہوئیں اور عدالتوں کا بائیکاٹ ہوا بعض کالجوں میں بھی بے چینی بڑھی اور طلبا کالجوں سے باہر نکل آئے۔ غرض ایک ہنگامہ تھا جو سارے ملک میں پایا جاتا اور ہر شعبہ زندگی پر اس کا اثر محسوس ہونے لگا تھا۔ حکومت بھی اس سے بے پروا

نہیں تھی عدم تعاون کی حمایت میں جلسوں اور جلوسوں کو منتشر کرنے کے لئے اس نے کبھی ڈنڈے اور گولی سے کام لینا شروع کر دیا تھا،

اس موقع پر علماء کا طبقہ بہت نمایاں ہو رہا تھا اس نے مذہب کے نام پہ پھر سے عوام مسلمانوں پر اپنا اقتدار حاصل کر لیا تھا، بات بات پر فتوے دینا اور ہندوستانی یا اسلامی ممالک کی سیاست پر خالص "قرآنی نقطۂ نظر" پیش کرنا اس کا خاص مشغلہ تھا چنانچہ تحریک ترک موالات کے جواز میں بھی ایک فتوے شائع ہوا جس پر ہندوستان کے تقریبًا پانچسو علماء کے دستخط تھے اس فتوے میں حکومت کے ساتھ تعاون کرنا حرام بتایا تھا اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دینا فرض قرار دیا تھا کچہریوں کی ملازمت اور وکالت کے پیشے کو حرام کہا تھا اور خطابات اور اعزازات کو قبول کرنے والوں کو کافروں کی صف میں داخل کر دیا تھا اور آخر میں اس "تحریک حقہ" میں شریک نہ ہونے والے کو میدان "جہاد" سے مفرور قرار دیا تھا۔

اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اسی سال کراچی خلافت کانفرنس میں زیر صدارت مولانا محمد علی تجویز کی صورت میں ایک اور "فتوے" منظور ہوا جس میں مسلمان سپاہیوں پر فوج کی ملازمت کو حرام مطلق قرار دیا گیا تھا۔ ان فتوے بازیوں نے اگرچہ وقتی طور پر عام مسلمانوں میں بڑا اشتعال پیدا کیا اور تحریک ترک موالات میں گرمی پیدا کر دی۔ جیل اور تعزیر کا خوف بھی ان کے دل سے دور ہو گیا اور حکومت کے جبر و تشدد کا اثر بھی ان پر سے جاتا رہا لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا۔ رد عمل اس کا یہ ہوا کہ عوام مسلمانوں کی ذہنیت ایک مدت تک کے لئے مسخ ہو گئی اور ان سے مذہبی اور سیاسی مسائل میں تمیز کرنے کی صلاحیت چھن گئی۔

کراچی کانفرنس کے بعد مسلمانوں کے پانچ انتہا پسند لیڈر (علی برادران

ڈاکٹر کچلو، مولانا حسین احمد اور پیر پگارو) فوج کے خلاف تجویز پاس کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ کراچی ہی میں ان پر مقدمہ چلا اور دو دو برس کے لئے جیل بھیجدئے گئے۔

تحریک ترک موالات کی رفتار ملک میں اب بھی تیز تھی، بلکہ ان گرفتاریوں کے باعث جو ہیجان بڑھ گیا تھا اس سے فائدہ اٹھا کر گاندھی جی نے سول نافرمانی کا پروگرام ملک کے آگے رکھ دیا۔

چنانچہ ۵ر نومبر ۱۹۲۱ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جو اجلاس دہلی میں ہوا اس میں تمام صوبجاتی کمیٹیوں کو اپنی ذاتی ذمہ داری پر سول نافرمانی کرنے کی اجازت دیدی گئی لیکن سول نافرمانی کرنے والوں کے لئے کھدر کا استعمال اور چرخہ کاتنا بھی لازمی قرار دیا گیا۔

۱۷ر نومبر کو پرنس آف ویلس ہندوستان آرہے تھے کانگرس نے ان کا بائیکاٹ کیا اور اس روز بمبئی میں مکمل ہڑتال رہی، بدیسی کپڑے جلائے گئے۔ جلسے ہوئے جلوس نکالے گئے لیکن اسی کے ساتھ فساد بھی ہو گیا، جس میں ۵۲ ہندوستانی ہلاک اور چارسو کے قریب زخمی ہو گئے۔

دسمبر ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگرس کا اجلاس ہوا اور اس اجلاس میں سول نافرمانی کی تجویز کانگرس نے منظور کر لی۔ کانگرس کے ساتھ خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی احمد آباد میں ہوئے۔ لیکن لیگ کا اجلاس اس مرتبہ قطعی بے جان تھا، اس لئے کہ مسلم لیگ کے جو انتہا پسند ممبر تھے وہ پہلے ہی خلافت یا جمعیتہ العلماء میں چلے گئے تھے اور جو اعتدال پسند رکن تھے وہ لیگ کو کانگرس کے ساتھ نتھی ہوتا ہوا دیکھ کر اس سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ چنانچہ لیگ کا اس سال کسی جگہ شمار نہیں تھا البتہ خلافت کمیٹی کے اجلاس نے کانگرس کا تتبع کرتے ہوئے سول نافرمانی کی تائید کی اور جمعیتہ العلماء کے اجلاس نے بھی جو اس سال

لاہور میں منعقد ہوا تھا اسے جوں کا توں قبول کر لیا۔

سول نافرمانی پورے جوش و خروش کے ساتھ شروع ہوئی۔ مسلمانوں نے
بہ حیثیت جماعت اس میں دل کھول کر حصہ لیا سروں پر پولس کے ڈنڈے اور سینوں
پر گولیاں کھائیں۔ اور ہزاروں کی تعداد میں سول نافرمانی کرتے ہوئے جیلوں میں
چلے گئے۔ لیکن عین اس وقت جبکہ سول نافرمانی کا شباب تھا، چورا چوری کا ناگوار
واقعہ پیش آ گیا اور گاندھی جی سول نافرمانی کے میدان میں دو ہی قدم چلے تھے کہ لوٹ پڑے
اس تحریک میں مسلمانوں نے سب سے زیادہ دلچسپی لی تھی اسی لئے گاندھی جی
کی اس رجعت کا اثر بھی سب سے زیادہ انہیں پر پڑا۔ چورا چوری کا واقعہ کوئی ایسا اہم
واقعہ نہیں تھا جسکو وجہ بنا کر سول نافرمانی کو واپس لینے میں گاندھی جی راستی پر کہے جاسکتے تھے
اس لئے کہ "انقلاب" کے دوران میں اس طرح کے واقعات پیش آنے لازمی تھے۔
——— انقلاب تو جنون اور دیوانگی کا ایک طوفان ہوتا ہے، وحشیانہ ہنگاموں
کا ایک سیلاب ہوتا ہے جو آن کی آن میں ہر اس چیز کو بہا لے جاتا ہے جو اس کی
راہ میں حائل ہوتی ہے۔ اس کا تو مفہوم ہی ان جذباتی بلکہ زیادہ صحیح یہ کہ ان غیر ذمہ دار
حیوانی قوتوں کی کارفرمائیوں سے عبارت ہے جو کسی قاعدہ قانون یا ضبط و نظم سے
مانوس ہی نہیں ہوتیں! ——— لیکن گاندھی جی کا "فلسفہ انقلاب"
اس سے مختلف تھا وہ "پرامن انقلاب" کے قائل تھے یعنی ایسا انقلاب جس میں
بدامنی کا ذرا بھی دخل نہ ہو!

انقلاب کا یہ "فلسفہ" چونکہ مسلمانوں کی "فہم" سے بہت اونچا واقع ہوا تھا
اس لئے وہ غریب ششدر ہو کر رہ گئے۔ انہیں افسوس تھا تو صرف اسقدر کہ انقلاب
کے اس انوکھے فلسفہ کے باعث ان کی ساری قربانیوں پہ پانی پھر کر رہ گیا!!

لیکن جو غیر جذباتی مسلمان تھے انہیں یہ شبہ ہوا کہ گاندھی جی نے یہ سول نافرمانی شاید اس لئے بند کردی کہ اس میں زیادہ تر مسلمانوں کا ہاتھ تھا اور مسلمان اپنی قربانیوں اور سرگرمیوں کے باعث ملک میں سیاسی اہمیت حاصل کرتے جا رہے ہیں!!

سیاسی بحران کے ردعمل کی یہ ابتدا تھی!

آٹھواں باب

سیاسی بحران کا ردِ عمل، شدھی، سنگھٹن، تبلیغ، تنظیم

۱۰ مارچ ۱۹۲۲ء کو گاندھی جی احمد آباد آشرم سے اس جرم میں گرفتار کر لئے گئے کہ انھوں نے اپنے اخبار "ینگ انڈیا" میں چار قابل اعتراض مضامین شائع کئے تھے۔ اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے انہیں اس جرم کی پاداش میں چھ برس قید محض کی سزا سنادی

گاندھی جی کے جیل جاتے ہی حامیان کانگریس کے فکر و عمل میں ایک قسم کا انتشار رونما ہو گیا سول نافرمانی کی تحریک گاندھی جی خود بند کر گئے تھے، ان کے بعد ترک تعاون کی تحریک بھی سرد پڑ گئی اور بعض سر برآوردہ کانگریسیوں نے سول نافرمانی اور ترک تعاون کی تحریکوں کی ناکامیوں کا عذر درمیان میں رکھ کر حکومت سے تعاون کر لینے کی تدبیریں سوچنی شروع کر دیں۔ کانگریسی حلقوں میں تو یہ انتشار پایا جاتا تھا اور کانگریس کے باہر یہ صورت تھی کہ سول نافرمانی کی "دلچسپیوں" کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں کے بعض جوشیلے رہنماؤں کو پھر وہی اپنا محبوب فرقہ وار مشغلہ یاد آیا۔ اور اب کے انھوں نے اس سلسلہ میں اپنی جدت پسندی کا بھی پورا پورا ثبوت دیا۔

سوامی شردھانند نے جو رولٹ ایکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے اور اچھے خاصے قوم پرست لیڈر کے روپ میں جیل گئے تھے، جیل سے واپس

آتے ہی شدھی کے نام سے ایک خالص فرقہ وارانہ تحریک شروع کر بیٹھے جس کا مقصد یہ تھا کہ دوسری قوموں کو ہندو مت میں شدھ کر لیا جائے اور چھوٹتے ہی ملکانہ راجپوتوں پر توجہ فرمائی جو غریب مسلمان تو تھے لیکن مذہب اسلام سے بس واجبی ہی سے واقف تھے، سماجی کی یہ حرکت بھلا مسلمانوں کو کیوں اچھی لگتی انہوں نے اس کی دوستانہ انداز میں شکایت کی لیکن جب ذمہ دار ہندو لیڈروں کی طرف سے ان شکایتوں کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو اس کا تدارک انہیں یہ سوجھا کہ شدھی کے جواب میں تبلیغ شروع کر دی جائے۔ مسلمانوں کے اس فیصلہ کے بعد مقابل کے دو اکھاڑے قائم ہو گئے اور ہندو مسلمانوں میں باقاعدہ ٹکر ہونے لگی اور یہ موقع چونکہ دو ڈھائی برس کی بھائی چارگی کے بعد حاصل ہوا تھا اس لئے دونوں طرف سے یہ کوشش تھی کہ اپنے دل کا غبار نکالنے میں کہیں کسر نہ رہ جائے!

لیکن جب یہ دیکھا کہ مار پیٹ میں ہندو جسمانی اعتبار سے مسلمانوں کے مقابلہ میں کچھ کمزور پڑ رہے ہیں تو رجز پڑھتے ہوئے پنڈت مدن موہن مالویہ اٹھے اور ہندو سورماؤں کو انہوں نے "ملیکش" مسلمانوں کے مقابلے کے لئے (جنہیں عالم غضب میں وہ کبھی کبھی "بدمعاش غنڈوں" کا خطاب بھی عطا فرما دیا کرتے تھے) سنگھٹن کا گر بتا دیا۔ مسلمانوں نے چپکے سے سنگھٹن کا جواب "تنظیم" میں عرض کیا جس کے بعد دونوں طرف سے بظاہر تحریکیں مکمل ہو گئیں۔ مار پیٹ، اغوا، بلوہ، اور فساد روزانہ کی خبروں کا جزو لازم بن گیا اور رفتہ رفتہ ہندو مسلم قضیہ پھر اسی نقطہ کی طرف کھسک آیا جہاں سے وہ دو برس پہلے آگے بڑھ گیا تھا،

مسلم لیڈروں کی رہائی اور سول نافرمانی کے ملتوی ہو جانے کے بعد مسلم سیاست میں سخت انتشار پیدا ہو گیا۔ مسلم لیگ انتہا پسندوں اور اعتدال پسندوں کے اختلافات

کے درمیان ختم ہو گئی خلافت کمیٹی برائے نام باقی رہی اس لئے کہ اس جماعت کے پاس کافی فنڈ تھا اور ابھی مسلمانوں کو اس سے ہمدردی باقی تھی لیکن اس کی روح سلب ہو چکی تھی۔ اس کا سارا تعمیری پروگرام مولانا ابوالکلام آزاد نے کانگرس سے متعلق کر لیا تھا اور اسے صرف چندہ جمع کرنے والی جماعت بنا کر چھوڑ دیا تھا۔ جمعیۃ العلماء البتہ قائم تھی، لیکن اس طرح کہ اس کا اپنا کوئی پروگرام مسلمانوں کے آگے نہیں تھا، کانگرس کی ہاں میں ہاں ملانا اس کا شعار تھا غرض ۱۹۲۳ء میں مسلمانوں کی کوئی منظم سیاسی جماعت ہندوستان میں باقی نہیں تھی اور نہ کوئی متعین پالیسی تھی جس پر مسلمان عمل کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس کی طرف جھک گئے تھے اور وہ مسلمانوں کو کانگرس کی طرف بلا رہے تھے۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی جیل میں تھے۔ علماء کی جماعت کانگرس کا جزو بن گئی تھی اعتدال پسند لیڈر ایک ایک کرکے پلیٹ فارم سے ہٹ چلے تھے اور سارے ہندوستان میں کوئی جماعت ایسی نہیں تھی جو اس موقع پر مسلمانوں کے آگے کوئی پروگرام رکھتی اور ان کے انتشار کو دور کرکے انہیں ایک مرکز پر جمع کر دیتی۔ اسی دوران میں متعدد چھوٹی چھوٹی تحریکیں اٹھیں لیکن ان میں سے ہر تحریک مسلمانوں میں مزید انتشار کا باعث ثابت ہوئی۔ عـ۵

اس دور کی مولانا محمد علی نے جس انداز سے تصویر کھینچی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے وہ فرماتے ہیں:۔

> جب ترک تعاون کی آزمائش والے زمانہ کے جیل خانوں سے نکلے تو انہوں نے اصلاح کی بہت کوشش کی مگر اب طوائف الملوکی کا زمانہ تھا ہر شخص "لیڈر" تھا

عـ۵ ان تحریکوں میں سب سے زیادہ مضرت رساں تحریک "ہجرت" کی تھی اس نے ہندوؤں کی ذہنیت پر بہت بُرا اثر ڈالا اور مسلمانوں کو ناقابل ساں، اخلاقی، سیاسی اور مالی نقصان پہونچایا یہ تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ تحریک کس "بزرگ" کے تراوش فکر کا نتیجہ تھی؟ ایک روایت یہ ہے کہ اس کے مصنف مولانا ابوالکلام آزاد تھے اگر یہ سچ ہے تو مولانا ابوالکلام کا یہ اتنا بڑا قومی گناہ ہے جو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا (مولف)

مقتدیوں کی اتنی کثرت تھی کہ مقتدی مشکل ہی سے کسی کو میسر آتے تھے
عوام پریشان تھے کہ کس کو رہنما سمجھیں۔ ایک۔ ایک راستہ پر لے جانا چاہتا
تھا تو دوسرا دوسرے راستہ پر اور ایک رہنما اپنا دوسرے کو راہ زن بتا رہا ہے
سب الگ الگ سُر الاپ رہے تھے "ذوق نغمہ" کی شدت اور کثرت
اب کہاں میسر آتی بہت سی طوطیوں نے اس نقار خانہ میں اپنی صدا کو
بند کر دیا ہے" (سیرت محمد علی ص۳۵۶)

بہرحال ملک میں ہر طرف "ناکام انقلاب" کا رد عمل شروع ہو گیا تھا اور بدقسمتی
یہ تھی کہ اس رد عمل میں بھی سب سے زیادہ جنہوں نے جانی مالی اور اخلاقی نقصان
اٹھایا، وہ مسلمان ہی تھے۔
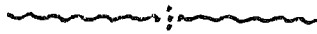
دسمبر ۱۹۲۲ء میں گیا میں کانگرس کا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں سی آر داس
اور موتی لال نہرو نے "سوراج پارٹی" کے نام سے ایک جدید سیاسی پارٹی کی بنیاد
رکھی جس کا مقصد یہ تھا کہ جدید اصلاحات کو ناکام بنانے کے لئے کونسلوں پر قبضہ کر لیا
جائے۔ اسوقت تک کانگرس سختی سے عدم تعاون کی حکمت عملی پر قائم تھی، لیکن اس
پارٹی کے قیام کے بعد جو کانگرس کے اندر ہی قائم ہوئی تھی کانگرس کے ممبروں میں
پھوٹ پڑ گئی اور کانگرس کی جماعت دو گروہوں میں منقسم نظر آنے لگی۔ ملک میں یہ
سیاسی صورت حال تھی جب اگست ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی جیل سے رہا ہو کر باہر
آئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی، خلافت کمیٹی کو خواب گراں سے جگایا، کانگرس کو
نئے سر سے منظم کرنے کی کوشش کی اور ملک میں اپنے پُر جوش بیانوں سے پھر گرمی
پیدا کرنی چاہی لیکن یہ رد عمل کا زمانہ تھا جذبات سرد ہوتے جا رہے تھے مولانا محمد علی
کی آواز اثر نہ کر سکی۔ دسمبر ۱۹۲۳ء میں مولانا محمد علی نے کانگرس اور خلافت کانفرنس

کی کوکنڈا میں صدارت کی۔ جمعیتہ العلمار کا اجلاس بھی وہیں ہوا تھا۔ اور مسلم لیگ کا اجلاس بھی ایک سال کی خاموشی کے بعد اسی سال دسمبر میں لکھنؤ میں ہوا لیکن ہر اعتبار سے بے جان تھا۔ محض ایک رسم تھی جو اس نام سے پوری کی گئی تھی۔ کانگرس کے اجلاس میں سوراج پارٹی کے حامیوں اور ترک تعاون کے مدعیوں میں بڑے زور کی رسہ کشی رہی اور گو اس اجلاس نے ترک تعاون والی تجویز کو بحال رکھا لیکن سوراج پارٹی بھی بدستور برقرار رہی۔

یہ قضیہ ۱۹۲۴ء میں گاندھی جی کی رہائی کے بعد طے ہوا اور سوراج پارٹی باوجود اپنے مسلک میں اختلاف کے کانگرس کا ایک جزو قرار پائی۔
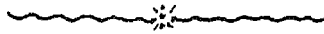
۱۹۲۴ء فرقہ وار تحریکوں کے لئے شباب کا زمانہ تھا۔ ہندو مسلم فسادات روزانہ کے معمولی واقعات تھے اور ان دونوں قوموں میں اس درجہ کشیدگی بڑھ گئی تھی کہ "اتحاد" کا خیال بھی جاتا رہا تھا۔ دہلی، کلبرگہ، لکھنؤ، الہ آباد اور کوہاٹ میں نہایت شدید فسادات ہوئے اور ہزاروں ہندو مسلمان ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ ان واقعات سے متاثر ہو کر گاندھی جی نے (۲۱) روز کا برت رکھا اور ان کے برت سے متاثر ہو کر ہندو مسلم لیڈروں نے دہلی میں ایک اتحاد کانفرنس طلب کی ایک ہفتہ تک متواتر اس کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے۔ ہندو مسلم اختلافات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیا گیا اور برائے نام ایک "قومی پنچایت" عالم وجود میں آگئی جس کے صدر گاندھی جی اور ممبروں میں حکیم اجمل خاں، لالہ پتھیت رائے، نہرو جیان۔ سندر سنگھ وغیرہ تھے اس پنچایت نے اپنے لئے کچھ قواعد وضع کئے اور عوام میں مذہبی آزادی کی تبلیغ کے لئے ایک پروگرام مرتب کیا۔ اسی کے ساتھ مسجدوں کے آگے باجا بجانے اور گاؤکشی کو بند کرنے کی اپیل کی گئی پریس کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ اپنی تحریروں میں احتیاط سے کام لے تحریرہ

غرض اس قومی پنچایت نے ہندو مسلم اختلافات کے گرد ایک حلقہ بنا دینا چاہا اور اصل موضوع کو چھیڑنے سے احتراز کیا اور اس سے زیادہ وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتی تھی، اس لئے کہ یہ کام اس کے بس کا نہ تھا۔ طے ہوا کہ اس کے لئے ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کی جائے تاکہ ہندو مسلم اختلافات کا کوئی واقعی حل دریافت ہو سکے۔

لیکن اس موقع پر ہندوؤں کی طرف سے جس ذہنیت کا مظاہرہ ہو رہا تھا اس کے پیش نظر آل پارٹیز کانفرنس بھی محض بیکار تھی۔ اس لئے کہ آل پارٹیز یا اتحاد کانفرنسیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب ان کے لئے ملک میں فضا سازگار ہو اور دونوں فریق دل سے اتحاد پر مائل بھی ہوں اور اسوقت صورت حال یہ تھی کہ ہندو کسی قیمت پر مسلمانوں کی سیاسی اہمیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

اگرچہ ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک پیکٹ بھی ہو چکا تھا، اور اُسے ہندو مسلم سمجھوتہ کی بنیاد بھی سمجھا جاتا تھا لیکن ہندوؤں نے اس معاہدے کی تکمیل کے بعد کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا اور اس سال جب کانگرس کے حلقوں میں ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں اس پیکٹ کا ذکر آیا تو پنڈت مالویہ اور لالہ جپت رائے نے اس کی شدید مخالفت کی خصوصًا جداگانہ انتخاب اور کونسلوں کی مسلم نشستوں میں "پاسنگ" پر اعتراض کیا گیا۔ جداگانہ انتخاب کو ملک کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں سے تعبیر کیا گیا اور بعض صورتوں میں تناسب آبادی سے زیادہ نشستوں کی تقسیم کو نامناسب رعایت بنایا گیا۔ بات بڑھی طے یہ ہوا کہ کانگرسی ممبروں کی ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی جائے جو اس پیکٹ پر نظرثانی کرے چنانچہ کمیٹی میں کام شروع ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے پورا نہ ہو سکا۔ اس لئے کہ ہندو ذہنیت اس کی تکمیل میں سد راہ بن گئی تھی اس کوشش کے بعد ایک آل پارٹیز کانفرنس کی تجویز یقینًا لاحاصل تھی، لیکن ہندو مسلم سمجھوتے کے حامیوں کو ایک

موقع اور دیا گیا۔

۱۹۲۵ء کے لئے مسلم لیگ کے صدر "لکھنؤ پیکٹ" کے مصنف مسٹر محمد علی جناح منتخب ہوئے۔ وہ خود ہمیشہ سے باعزت ہندو مسلم سمجھوتے کے حامی تھے۔ اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے ہندو مسلم اتحاد پر پورا زور دیا اور اسے سوراج کے حصول کا واحد ذریعہ بتایا۔ چنانچہ مسٹر محمد علی جناح بھی آل پارٹیز کانفرنس کو کامیاب بنانے میں کانگریسی ممبروں کے ساتھ ہو گئے اور اس کے ہر اجلاس میں برابر شرکت کرتے رہے۔ لیکن اس ساری دوڑ دھوپ کا نتیجہ اب بھی کچھ نہیں تھا۔ ہندو کسی طرح جداگانہ انتخاب کو تسلیم نہیں کرتے تھے اور مسلمان کسی قیمت اپنے اس حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ اس کشمکش میں ظاہر ہے کہ کوئی فارمولا مرتب نہیں ہو سکتا تھا۔ کانفرنس بری طرح ناکام رہی اور ہندو مسلم اختلافات بدستور قائم رہے۔

اس ناکامی کے بعد ہندو مسلم سوال ہی کو کانگریس نے اپنے پروگرام سے حرف غلط کی طرح مٹا دیا جس سے کانگریس کے حامی مسلمانوں کی پوزیشن بہت نازک ہو گئی اور عام مسلمانوں کی نظروں میں انہیں اپنا وقار قائم رکھنا مشکل ہو گیا لیکن عین اسی وقت حجاز کا مسئلہ چھڑ گیا، شریف حسین اور ابن سعود میں لڑائی ہو پڑی، اسلامی مقامات مقدسہ پر قبضہ اور اقتدار کا سوال پیدا ہو گیا اور یہ غور ہونے لگا کہ ہندوستانی مسلمان عرب کے ان دونوں لڑنے والوں میں کس کی حمایت کریں؟

خلافت کے خاتمہ کے بعد خلافت کمیٹی کا وجود بیکار سا ہو رہا تھا، اس نے فوراً اس سوال کو اپنی طرف سے اچھال دیا، گویا جس میں چنگاری دیدی خود مسلمان اس سوال پر آپس ہی میں الجھ گئے۔ اصل مسئلہ سے ان کی توجہ ہٹ گئی اور انتہا پسند لیڈر عوام کے احتساب سے بچ گئے۔

لیکن یہ چیز عارضی تھی، اور خود ان لیڈروں کو بھی اس کا احساس تھا اصلی گتھی تو ہندو
مسلم تعلقات کی تھی جس کے سلجھانے کی ان پر پوری پوری ذمہ داری تھی۔ اس لئے کہ
انہی لیڈروں نے غیر مشروط طریقہ پر ۱۹۱۸ء میں ہندوؤں سے سیاسی رشتہ جوڑا تھا۔
اور وہی اس رشتہ کو مضبوط اور مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے ذمہ دار بھی تھے!

چنانچہ اسی ذمہ داری کے احساس نے ان میں ایک نیا عزم پیدا کر دیا، ایک طرف
انہوں نے مسئلہ حجاز کو پوری قوت سے اٹھایا تاکہ عام مسلمان اس میں گم ہو کر رہ جائیں
اور دوسری طرف انہوں نے ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ وار فضا کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا
لیکن یہ مقابلہ یک طرفہ تھا، مسلمان لیڈر تو مسلم رجعت پسندوں کو نہایت سختی سے
دبا رہے تھے لیکن ہندوؤں کے نام نہاد قوم پرست لیڈر اپنے رجعت پسند افراد کو ایک
حرف بھی نصیحتاً کہنے کو تیار نہیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا مسلمانوں کے انتہا پسند اور
اعتدال پسند لیڈروں میں ٹھن گئی۔ ہندو شیر ہو گئے اور ملک کی فرقہ وار فضا اور زیادہ
کدر ہونے لگی۔ اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا محمد علی فرماتے ہیں:۔

"جب پنڈت موتی لال نہرو نے مہاسبھائیوں کو ایک حرف بھی کہنے سے
انکار کیا تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے بیزار ہو کر ان سے صاف
کہہ دیا کہ اب وہ مسلمانوں سے کچھ توقع نہ رکھیں"

گویا مسلمانوں کے انتہا پسند لیڈروں کو اپنے مشن میں ناکامی ہوئی اور ہندوؤں
کے متعلق ان کا وہ اندازہ غلط نکلا جو انہوں نے غالباً جلدی میں، اعتدال پسند لیڈروں
سے اختلاف کرتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں قائم کر لیا تھا۔ اس اعتراف کے بعد اب
ان مسلم لیڈروں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا تھا کہ وہ پیچھے سے اس
مسئلہ میں اعتدال پسندوں کا نظریہ قبول کر لیں اور مسلمانوں کی ایک جداگانہ قوم
کی حیثیت سے تنظیم شروع کر دیں۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں مولانا محمد علی دہلی میں خلافت

کانفرنس کے اسپیشل اجلاس کے انعقاد کی غرض وغایت یوں بیان فرماتے ہیں :-

"جب ہماری سعی لاحاصل رہی اور ایک ہندو لیڈر بھی ہندو مہاسبھاؤں کے خلاف کچھ نہ بولا تو ہم نے دہلی میں اسپیشل خلافت کانفرنس کا اجلاس طلب کیا اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کی صدارت حکیم اجمل خاں رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی اور کانفرنس کی صدارت مولانا سید سلیمان ندوی نے" (سیرت محمد علی صـ۱۹۱ـ)

انتہا پسند مسلم لیڈروں کے سیاسی زاویوں میں اس تبدیلی کے بعد مسلم سیاست رفتہ رفتہ پھر اپنی پرانی سطح پر آتی گئی اور انتہا پسندوں کا دباؤ مسلمانوں پہ سے کم ہوگیا۔
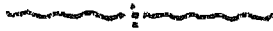
نواں باب

"ایجیٹیشن" کے دور کی مسلم سیاست پر ایک نظر

ابتدائی اوراق میں یہ تفصیل سے بتایا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد سے وہ کیا حالات پیدا ہوئے جن کے باعث مسلم سیاست عالم وجود میں آئی۔ یہ حالات کچھ تو اس انتقامی پالیسی کا نتیجہ تھے جو انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف اختیار کر رکھی تھی اور کچھ اس طرز حکومت کے باعث پیدا ہوئے تھے جو ۱۸۵۸ء میں ہندوستان کو تاج برطانیہ کے زیر نگیں ایک مقبوضہ قرار دیکر رائج کیا گیا تھا۔

انگریزوں کو ہندوستان پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے زیادہ تر چونکہ مسلمانوں ہی سے لڑنا پڑا تھا اور مسلمانوں ہی کو وہ اپنا رقیب اور مقابل بھی سمجھتے تھے اسلئے اپنے تسلط کے بعد ایک طرف تو انہوں نے مسلمانوں کے خلاف علانیہ ہندؤں کو ابھارا اور دوسری طرف نئے دستور حکومت میں اس بات کا خیال رکھا کہ سارے ہندوستان میں ہندؤں کو سیاسی غلبہ حاصل رہے اور مسلمان آئینی طور پر ہمیشہ کیلئے اکثریت کے رحم وکرم پر ہو جائیں تاکہ اگر پھر کبھی مسلمان سر اٹھائیں تو اکثریت انہیں اپنے مفاد کی خاطر دبانے کے لئے تیار رہے اور حکومت برطانیہ کو بے کھٹکے ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع مل جائے۔

حکومت برطانیہ کی اس پالیسی کا موثر جواب صرف یہی ہو سکتا تھا کہ ہندو اور مسلمان ملکر ہندوستان میں پھر ایک انقلاب پیدا کریں اور مساویانہ اصولوں پر ہندو مسلم مشترک حکومت کی بنیاد ڈالدیں۔

یہی وہ مرکزی خیال تھا جس نے مسلمانوں کے جوشیلے طبقہ کو بے خود کر دیا اور اس نے مآل کی پروا کئے بغیر ایک اور انقلاب کی جدوجہد شروع کر دی۔ حالانکہ اس وقت جذبات سے مغلوب ہونے کی نہیں بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اُسے یہ سوچنے کی ضرورت تھی کہ آخر ہندو اس انقلاب میں حصہ کیوں لیں؟ انگریزوں کی مدد سے جو سیاسی غلبہ انہیں ملک میں حاصل ہو گیا ہے اس میں مسلمانوں کو وہ آخر اپنا شریک کیوں بنائیں؟ مسلمانوں کے اتحاد اور ہندو مسلم مشترک حکومت کے قیام سے آخر انہیں دلچسپی کیوں ہو؟ مسلمانوں نے مدتوں ہندوستان پر حکومت کی ہندو بادل ناخواستہ ان کی رعایا بنے رہے اتنی مدت بعد پھر ہندوستان میں انقلاب ہوا، اور اس انقلاب نے ہندوں کو یہ موقع دیدیا کہ وہ ابھریں، پستی سے بلندی پر آئیں، اپنی قومیت کی نئے سرے سے تعمیر کریں۔ اس موقع کو ہاتھ سے دیکر اور محض ان مسلمانوں سے اتحاد کی خاطر دوبارہ انقلاب کیوں پیدا کریں جن کے متعلق برابر یہ شبہ باقی ہے کہ موقع ملتے ہی ہمسایہ اسلامی سلطنتوں کی مدد سے وہ پھر ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لیں گے؟

البتہ ہندوں کو نئی حکومت کے زیر سایہ اپنی مضبوط قومی تعمیر کے لئے ملک پر زیادہ سے زیادہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہش تھی، اور اسی کے لئے انہوں نے جدوجہد شروع کر دی۔ مسلمانوں کا پُرجوش طبقہ جو پہلے ہی جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا یہ سمجھا کہ یہ "آزادی کی جنگ" ہے۔ بلا کسی شرط کے اس جدوجہد

میں ہندوؤں کے ساتھ ہو گیا۔ ہندوؤں نے اس نئی طاقت کا خیر مقدم کیا اور بڑے سلیقے سے اُسے اپنے مقصد کا آلہ کار بنا لیا!

⁂

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ہندوؤں کی یہ ساری جد و جہد ملک پر محض اپنے قومی غلبہ اور سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے تھی ہندوستان کی "آزادی" کے لیے نہیں تھی ہمیں کچھ زیادہ چھان بین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سلف گورنمنٹ، ہوم رول اور سوراجیہ کی تحریکوں کا سرسری مطالعہ ہی کافی ہے اس لیے کہ انہی تحریکوں سے ہندوستان میں سیاسی جد و جہد کی ابتدا ہوئی اور انہی کو اپنا مقصود قرار دے کر ۱۹۱۸ء میں وہ ایجی ٹیشن شروع کیا گیا تھا جس کے اثرات کی ہم اس باب میں تحقیق کر رہے ہیں۔ سلف گورنمنٹ، ہوم رول یا سوراجیہ کا مقصد کیا تھا اس کو آپ سوراجیہ کے 'امام' اور ہندوؤں کے مقبول ترین لیڈر لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک کی زبانی سنیئے۔ یکم مئی ۱۹۱۶ء کو بلگام میں ہوم رول پر پہلی تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"آخر ہم کیا مطالبہ کرتے ہیں کیا ہم انگریزی گورنمنٹ کو نکالنا چاہتے ہیں؟ آیا شہنشاہ کا اس میں کچھ نقصان ہوتا ہے کہ ملک کا انتظام ممبران سول سروس کریں یا کہ ہمارے "ہیلوی صاحب"؟
انگریزی حکومت برقرار رہے گی شہنشاہ معظم بدستور ہمارے حاکم رہیں گے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ بجائے گورے ملازموں کے بادشاہ کے کارکن کالے آدمی ہوں گے۔" (پیغام آزادی ص۸۲)

اور احمد نگر میں ۳۱ مئی ۱۹۱۶ء کو اسی موضوع پر دوسری تقریر کرتے ہوئے لوکمانیہ کہتے ہیں:-

"اس سوراج کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انگریزی حکومت الٹ دی جائے

یا شہنشاہ کی حکومت ہٹادی جائے اور اس کی جگہ کسی دیسی مہاراجے کی حکومت قائم کردی جائے۔ سوراج کے معنی وہ ہیں جو مسٹر کھاپرڈے نے بلگام میں بیان کئے یعنی ہم مندر کے پجاریوں کو بدلنا چاہتے ہیں۔ بھگوان کی مورتی بدستور قائم رہیگی" (پیغام آزادی صلا۱۰۱)

آگے چلکر اسی خیال کو زیادہ صفائی کے ساتھ یوں پیش کرتے ہیں:-

"سوراجیہ کے معنی جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا یہ ہیں کہ ہمارا شہنشاہ بدستور بحال رہے اور انگریزی حکومت قائم رہے۔ اور باقی تمام معاملات کے انتظام کرنے کا باشندگان ملک کو اختیار حاصل ہو۔ یہ سوراجیہ کی تعریف ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ "انگلش حکومت کمزور ہوجائے یا انگریزی گورنمنٹ (ہندوستان سے) چلی جائے اور بجائے اس کے جرمن گورنمنٹ قائم ہوجائے بلکہ بخلاف اس کے موجودہ جنگ نے ثابت کردیا اور ساری دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ یہ ہماری خواہش ہرگز نہیں ہے کہ یہاں جرمن حکومت ہو بلکہ اس مطلب کے لئے کہ اس گورنمنٹ کی حکومت یہاں دائمی طور پر رہے آج کے دن ہمارے ہزاروں آدمی نہایت دور دراز اور سرد ملکوں میں اپنی جانیں نثار کررہے ہیں"

(پیغام آزادی صلنا۱۰۲و۱۰۳)

اور الہ آباد میں ہوم رول لیگ کے اجلاس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء کو ہوم رول کے خلاف اعتراضات کا جواب دیتے ہیں مسٹر تلک کہتے ہیں:-

"ہوم رول کے خلاف ایک اعتراض پیش کیا جاتا ہے کہ اگر آپ کو ہوم رول دیدیا گیا تو آپ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینگے"

لیکن یہ بالکل وہم ہے، ہندوستانیوں کو تو انگریزوں کی انگریزی انسٹی ٹوشنوں کی اور انگریزی سلطنت کی ضرورت ہے وہ تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا اندرونی انتظام ہندوستانیوں کی زیر نگرانی رہے۔" (پیغام آزادی ص۱۵۹)

لوکمانیہ تلک انجہانی کی ان تصریحات کے بعد یہ ثابت کرنے کو غالباً کسی اور شہادت کی ضرورت نہیں ہے کہ سلف گورنمنٹ اسوراجیہ یا ہوم رول کا مقصد اس سے زیادہ اور کچھ نہیں تھا کہ انگریزی حکومت کے زیر سایہ ملک کے انتظام میں دخل حاصل ہو جائے اور ہندوستانیوں کا سیاسی اقتدار بڑھ جائے ــــ اور ظاہر ہے کہ برطانیہ کے رائج الوقت طرز حکومت کے مطابق سیاسی اقتدار کی تقسیم میں زیادہ سے زیادہ حصہ ملک کی اکثریت کا ہوتا۔ جو نہ صرف بہ اعتبار آبادی ملک پر چھائی ہوئی تھی، بلکہ اسی نسبت سے علم و تجربہ میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے تھی اور ملک کے معاشی وسائل پر بھی اس کا قبضہ تھا۔

ــــــــــ : ــــــــــ

ہندوؤں کے ساتھ ایجی ٹیشن میں بلا شرط اشتراک عمل کرنے کی سب سے بڑی دلیل مسلمانوں کے جوشیلے طبقہ کے پاس یہ تھی :۔

"ہندوؤں سے ہمیں مطلق خوف نہیں ہے ملک پہلے آزاد ہو جائے ہم ہندوؤں سے بعد میں نپٹ لینگے محمد بن قاسم کے ساتھ اگر مٹھی بھر مسلمان ہندوستان آکر یہاں اپنی جگہ بنا سکتے تھے تو آج نو کروڑ مسلمانوں کا ہندو اکثریت کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

اور یہی دلیل آج بھی بعض کانگرسی مسلمان اپنے مسلک کے جواز میں پیش کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ دلیل آج بھی اسی طرح غلط ہے جس طرح

آج سے پہلے تھی۔ اس لئے کہ یہ ایک قسم کا "مغالطہ" ہے۔ محمد بن قاسم کے مٹھی بھر مسلمان ہندوستان میں جنگ کرنے آئے تھے اور آج نو کروڑ کی مسلم آبادی اپنے وطن میں باعزت شہری کی طرح زندہ رہنا چاہتی ہے۔ اُس زمانہ میں قومی برتری کا مسئلہ میدان جنگ میں اسلحہ کی مدد سے طے ہوا کرتا تھا، اور آج حکومت کے ایوانوں میں سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر طے ہوتا ہے۔ اس وقت کا قانون تھا جس کی لاٹھی اس کی بھینس اور آج کا قانون ہے :-

"انگریز کی لاٹھی ہندو کی بھینس"!

انگریز کی سنگین اگر درمیان سے ہٹ جائے تو فی الحقیقت یہ دلیل صحیح ہے۔ نو کروڑ مسلمان آج بھی (۳۰) کروڑ ہندوں پر بھاری ہو سکتے ہیں۔ لیکن کیا ہندو اس سنگین کو درمیان سے ہٹ جانے دیں گے؟ لوکمانیہ تلک کے ان بیانوں کے بعد کیا اب بھی اس مغالطہ کی گنجائش رہ گئی ہے کہ ہندو اس ملک کو انگریزوں سے "آزاد" کرانا چاہتے ہیں؟

انگریزوں کو جب اس ملک سے نکال باہر کرنے کا سوال ہی خارج از بحث ہو گیا تو ملک کی "آزادی" کا تصور کہاں پیدا ہوا؟ اور جب آزادی کا خیال ہی مٹ گیا تو اس دلیل کا کیا وزن رہ گیا کہ "آج نو کروڑ مسلمانوں کا ہندو اکثریت کچھ نہیں بگاڑ سکتی"! رہا تقسیم اقتدار کا سوال۔ یہ رزمی نہیں آئینی سوال ہے۔ اس کا حل جنگ کے میدانوں نہیں سیاست کے ایوانوں میں ہوتا ہے اور اسے جوش و جذبہ کے ساتھ نہیں بلکہ ٹھنڈے دل و دماغ سے طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

ایجی ٹیشنوں سے اس کی ضرورت اور قربانیوں سے اس کی اہمیت ضرور جتائی جا سکتی ہے لیکن اسے حل نہیں کیا جا سکتا!!

خلافت ایجی ٹیشن میں مسلمانوں نے جس جذبۂ ملی اور جوش قومی کا مظاہرہ کیا اور جس وارفتگی و سرشاری کے ساتھ اس راہ میں اپنی جان اور اپنے مال کی قربانیاں پیش کیں آج اس کا تصور ہی جذبات میں ہیجان کا ایک طوفان برپا کر دیتا ہے۔

ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی تاریخ میں یہ اولین ایجی ٹیشن ہے جس نے صحیح معنوں میں ملک میں بیداری پیدا کر دی اور ہندوستانیوں کو سرفروشی کی شاہراہ بتادی۔ اور یقیناً اسی امتیاز اولیت کے ساتھ یہ تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی رہیگا۔

لیکن کچھ دنوں بعد جب مورخ کا بے رحم قلم اس ایجی ٹیشن کے جذباتی اثر سے آزاد ہوکر اس کا جائزہ لیگا۔ اور خالص سیاسی نقطۂ نظر سے اسے جانچیگا تو ایجی ٹیشن کا یہ سارا دور اپنی ہنگامہ خیزیوں کے باوجود اُسے ایک ایسا بے نتیجہ سیاسی بحران نظر آئیگا جس نے مسلمانوں کی قومی خودداری کا خاتمہ کر کے رکھدیا!

کیا مسلمانوں کے جذبۂ ملی اور جوش قومی کی یہی قیمت ہونی چاہئے؟ کیا انکے ایثار اور قربانی کی یہی قدر ہو سکتی ہے؟

خلافت ایجی ٹیشن بے نتیجہ کیوں رہا؟ اس سوال کا صرف ایک جواب ہے اس ایجی ٹیشن کے لئے مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی پروگرام نہ تھا!

ہندوں کا پروگرام تھا ہندو ہی اس کے رہنما تھے، مسلمانوں کی حیثیت اس ایجی ٹیشن میں ان کے آلہ کار سے زیادہ نہیں تھی، اسوقت تک ان سے کام لیا جب تک انہیں ضرورت رہی۔ اور اس وقت ایجی ٹیشن بند کر دیا جب ان کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اور مسلمانوں کو اتنی قربانیوں کے بعد بھی یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ اس ایجی ٹیشن کے جاری رکھنے یا ختم کر دینے پر مشورہ بھی دے سکتے!

٭٭٭

اس ایجی ٹیشن کی دوسری کمزوری یہ تھی کہ اس میں مسلمانوں کو اپنے سیاسی مطالبات پر منظم نہیں کیا گیا بلکہ ان کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے انہیں حکومت سے ٹکرا دینے کی کوشش کی گئی۔ خلافت کے مسئلہ کو صرف مسلمانانِ ہند ہی سے تعلق نہ تھا۔ یہ سارے عالم اسلام کا معاملہ تھا، اس کے حل کرنے کی ذمہ داری صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے سر ڈال دینا مآل اندیشی کے قطعاً خلاف تھا اور اگر محض مسئلہ خلافت ہی کو سلجھانے کے لئے یہ ایجی ٹیشن شروع کیا گیا تھا تو اس کا رخ بغیر کسی تنظیم اور موثر لائحہ عمل کے ’ترک تعاون‘ کی تحریک کی طرف پھیر دینا اس سے بھی بڑی غلطی تھی۔

بلا شبہ مسلمانوں کو مسئلہ خلافت کی مذہبی حیثیت سے دلچسپی تھی۔ لیکن ’ترک تعاون‘ کی تحریک مذہبی نہیں بلکہ خالص سیاسی تحریک تھی اور ان دونوں کا آپس میں کوئی تعلق نہ تھا خلافت کی بحالی کے لئے ایجی ٹیشن کرنا تو پھر بھی سمجھ میں آسکتا ہے بہر حال مسلمانوں کے آگے کوئی منزل مقصود تو تھی لیکن ترک تعاون کی تحریک میں شرکت کرنے کا مقصد کیا متعین کیا گیا تھا؟ ——— ہندوستان کی آزادی؟ ——— سیاسی اقتدار کا حصول؟ اول الذکر مقصد محض سراب تھا جیسے خلافت ایجی ٹیشن کے ذمہ دار لیڈر بھی خوب جانتے تھے اور ثانی الذکر مقصد صرف ”شرائط تعاون“ کی بنیادوں پر ہی حاصل ہو سکتا تھا ——— کیا خلافت ایجی ٹیشن کے ذمہ دار لیڈروں نے شرکت سے پہلے ”شرائط تعاون“ طے کر لی تھیں؟؟

”سیاست کو مذہب سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا“ ——— اگر اس نظریہ کو صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ——— کیا قومی تنظیم کے بغیر محض مذہبی جوش و خروش کے بل پر کسی خالص سیاسی مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔؟

بد قسمتی سے ہمارا مذہبی گروہ اسی کا قائل ہے۔ حالانکہ ۱۸۳۱ء کے بعد سے جب سے اس نے ہندوستان کی سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کیا ہے اب تک کسی سیاسی مسئلہ کو وہ محض مذہبی جوش و جذبہ کے ماتحت کامیابی سے حل نہ کر سکا۔ بلکہ اس کے برخلاف (اگر اس صاف گوئی کو معاف کر دیا جائے) اس نے اپنی شمولیت سے ہمیشہ ملک میں انتشار پیدا کیا جو سیاسی اعتبار سے ہمیشہ ملک کے لئے مہلک ثابت ہوا۔

ہندوستان کی سیاست میں مذہبی گروہ کی عملی دلچسپی کی ابتدار مولوی سید احمد بریلوی سے شروع ہوتی ہے انہوں نے سکھوں کے خلاف اعلان جہاد کرتے ہوئے اپنے مسلک کو اس طرح واضح کیا تھا۔

"جب آپ (مولوی سید احمد بریلوی) سکھوں پر جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے کسی شخص نے پوچھا آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کیوں جاتے ہیں۔ انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے منکر ہیں گھر کے گھر ہیں ان سے جہاد کرکے ملک ہندوستان لے لیں یہاں لاکھوں آدمی آپ کے شریک اور مددگار ہو جائیں گے۔

جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصود ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے ہیں اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے میں مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات . . . . . سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہیگی اور سرکار انگریزی گو منکرِ اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے

پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گرادیں"۔ (سوانح احمدی بحوالہ روشن مستقبل ص۱۰)
سکھوں کے خلاف جہاد ممکن ہے مذہبی اعتبار سے ضروری سمجھا گیا ہو لیکن سیاسی حیثیت سے یہ نہایت تباہ کن اقدام ثابت ہوا جس نے مسلمانوں کی رہی سہی طاقت کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ سکھوں کے خلاف ناکام جہاد کے بعد انگریزوں کے خلاف مذہبی جذبات کو بھڑکانے کی کوشش ہوتی ہے جس کا عبرتناک ثبوت غدر ۱۸۵۷ء کے نام سے تاریخ ہندوستان میں محفوظ ہے اس اقدام نے ہندوستان کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً جانی، مالی، اخلاقی اور سیاسی حیثیتوں سے جس قدر نقصان پہونچایا وہ بجائے خود ایک دردناک کہانی ہے۔

اس گروہ کے مسلک میں یہ تبدیلی کہ سکھوں کے بعد حکومت انگریزی کی طرف پلٹ پڑا، کن اسباب کی بنا پر واقع ہوئی۔ یہ اب تک پردہ خفا میں ہیں یا کم از کم باوجود تلاش و تفحص ہمیں نہ مل سکے۔

غدر کے بعد ۱۹۱۶ء میں ملک کی بےچینی سے فائدہ اٹھا کر انقلاب کی پھر ایک ہلکی سی کوشش کی جاتی ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر مذہب کے نام سے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف انتہائی ہیجان و اشتعال پیدا کیا جاتا ہے لیکن نتیجہ اب بھی مسلمانوں ہی کی تباہی اور بربادی کی شکل میں نکلتا ہے۔

٭٭٭

اس مذہبی گروہ کے جذبہ خلوص و ایثار میں مطلق شبہ نہیں، اور اسے مذہب اور مسلمانوں کے مفاد سے جو شیفتگی اور دلچسپی ہے اس میں کبھی کلام نہیں۔ اسی کے ساتھ آزادی وطن کی جو تڑپ اس گروہ میں پائی جاتی ہے اس کے احترام میں کبھی بخل نہیں ہو سکتا ——— لیکن ان سارے اعترافات کے باوجود

یہ حقیقت اب بھی اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ :۔

"قومی تنظیم کے بغیر محض مذہبی جوش و خروش کے بل پر کسی سیاسی مسئلہ کا حل نہیں ہو سکتا۔"

جب کبھی ایسی کوشش کی جائیگی نتیجہ ہمیشہ تباہی اور ناکامی نکلیگا۔ اس لئے کہ مذہب کا دل سے اور سیاست کا دماغ سے تعلق ہے اور دل کے تاثرات میں دماغ کو ماؤف کر کے سیاست کی گتھی سلجھانے کی صلاحیت نہیں۔

مذہب میں "نیت" کا عذر قبول کر لیا جاتا ہے۔ لیکن سیاست کا حکم محض "نتیجہ" پر صادر ہوتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نیت کا عذر درمیان میں رکھکر کسی فرد یا جماعت کو اپنے "نامبارک فعل" کی مذہبی پاداش سے بچا لیا جائے لیکن سیاسی پاداش سے اُسے ہرگز نہیں بچایا جا سکتا!

چنانچہ "اسی سیاسی پاداش" کو ہندوستانی مسلمان ایک مدت سے بھگت رہے ہیں اور برابر اسوقت تک بھگتتے رہیں گے جب تک ہمارے علمار کی ذہنیت میں تبدیلی نہ ہوگی اور وہ سیاست میں مداخلت کے لئے سیاسی بصیرت اور قومی تنظیم کی ضرورت کا اعتراف نہ فرمائیں گے۔

۱۹۱۶ء میں مسلم سیاست ابتدائی مراحل طے کرتی ہوئی جہاں پہونچ چکی تھی ۱۹۱۸ء کے بعد وہاں قائم نہ رہ سکی۔ خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلمار کے قیام سے مسلمانوں میں ایک قسم کا انتشار سا پیدا ہو گیا اور ان کے فکر و خیال کی وہ مرکزیت غائب ہو گئی جو کچھ دنوں پہلے تک اپنی قوم سے متعلق بعض اہم سیاسی مسائل میں انہیں حاصل تھی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایجی ٹیشن کے دوران میں مسلمانوں کی کوئی مستقل سیاست ہی باقی نہیں رہی تھی، اور نہ کسی خاص مسئلہ پر ان کی اپنی کوئی رائے ہوتی تھی "مسلم لیگ

اعتدال پسند اور انتہا پسندوں کی کشمکش میں ختم ہو چکی تھی۔ خلافت کمیٹی کانگریس کا ایک جزو بن گئی تھی اور جمعیتہ العلمار کی حیثیت ان دونوں جماعتوں کے "مذہبی نقیب" کی سی تھی۔

کانگریس کوئی نئی تحریک وضع کرتی، خلافت کمیٹی اس پر عمل کرنے کو میدان میں اتر آتی اور جمعیتہ العلمار اس تحریک کو قرآن و احادیث سے مطابق ثابت کرکے فتوے شائع کیا کرتی۔ گویا کانگریس کے فیصلے قرانی احکام کے مطابق ہوا کرتے تھے اور قرآن کو ماننے والی یہ دونوں جماعتیں ان فیصلوں پر اپنی ایمانداری کے ساتھ عمل کرتی تھیں اس سے زیادہ سرگرمی دکھانے کی انہیں نہ ضرورت تھی اور نہ خواہش!

کسی سیاسی جماعت کو اپنا وجود حق بجانب ثابت کرنے کے لیے ملک کے آگے اپنا لائحہ عمل پیش کرنا ضروری ہوتا ہے لیکن خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلمار ہند نے اپنے قیام کے بعد سے کوئی تعمیری اور عملی پروگرام قوم کے آگے نہیں رکھا، خلافت کمیٹی تو صرف ایجی ٹیشن کرنے والی جماعت تھی پہلے اس نے خلافت کے لیے ایجیٹیشن کیا، بعد کو ترک تعاون کے سلسلہ میں سرگرمی دکھائی اور اپنی زندگی کے آخری دور میں شریف حسین اور ابن سعود کی لڑائی کو اچھالا۔ تھوڑا بہت اگر مسلمانوں کا تنظیم کے سلسلہ میں کام کیا بھی تھا تو وہ بھی اسی وقت کانگریس کے نذر کر دیا اور اپنے آپ ہر قسم کا ایجی ٹیشن ختم کر چکنے کے بعد محض چندہ وصول کرنے والی جماعت بن جانے پر قناعت کر لی۔ لیکن جمعیتہ العلمار کی یہ صورت نہیں تھی اس کے قیام کا مقصد "تحفظ ملت اور اور سیاسیات میں مذہبی حیثیت سے مسلمانوں کی رہنمائی" بتایا گیا تھا۔ اس اہم مقصد کی تکمیل ظاہر ہے کہ اپنے ایک مخصوص عملی پروگرام کے بغیر نہیں ہو سکتی تھی لیکن جمعیتہ نے اس بلند دعوے کے باوجود اپنا کوئی عملی پروگرام مسلمانوں کے آگے پیش نہیں کیا۔ بلکہ کانگریس کے احکام اور فیصلوں کا "مذہبی مفتی" بنا

رہنا پسند کیا۔

یہی دونوں جماعتیں تھیں جو ایجی ٹیشن کے دوران میں مسلم لیگ کو حقارت سے رجعت پسند کا خطاب دیکر آگے بڑھ گئی تھیں۔ مسلمانوں کی باگیں گویا ان کے ہاتھ میں تھیں اور مذہب و سیاست دونوں پر ان کا قبضہ تھا چنانچہ مسلمانوں میں ہیجان و اشتعال پیدا کرنے کا جہاں تک تعلق تھا واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں نے حق ادا کر دیا تھا لیکن جب اس بحران کا رد عمل شروع ہوا تو ان کا کہیں ٹھکانہ نہ ملا۔ خلافت کمیٹی تو اس ریلے میں صاف بہہ گئی، جمعیتہ العلماء اپنے گوشۂ عافیت میں پلٹ پڑی کانگریس کو مسلمانوں سے کیا ہمدردی ہو سکتی تھی، مسلم لیگ کس قابل رہ گئی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ رد عمل کا دھارا کبھی عوام مسلمانوں ہی کو اپنے سینوں پر روکنا پڑا کہیں شدھی کے دھکے کھائے کہیں سنگھٹن کے تھپیڑے سہے، کہیں گائے کی قربانی پر سر پھڑوایا جانیں دیں، کہیں اذان اور نماز کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ذبح ہو گئے۔ اس عالم بیچارگی میں جس کو اپنا رہنما سمجھا اسی نے انہیں نقصان پہونچایا جس کو اپنا لیڈر بنایا اسی نے ان کو گمراہی میں پھنسایا۔ غرض ایک اضطراب ایک انتشار تھا جو ملک کے طول و عرض میں پایا جاتا ہے اور مسلمان بھیڑوں کے ایک ایسے گلہ کے مانند ہو گئے تھے جس کا کوئی رکھوال نہ ہو۔

سنہ ۱۹۲۶ء تک حالات اس نوبت پہ پہونچ چکے تھے جب مسلمانوں کے بعض حساس لیڈروں کو ہوش آیا، تنظیم ملت کی ضرورت تسلیم کی گئی۔ اعتدال پسندوں کو دوبارہ ملکی سیاست میں بار ملا اور دس برس بعد مسلم سیاست رفتہ رفتہ پھر اسی نقطہ کی طرف لوٹنی شروع ہوئی جہاں سنہ ۱۹۱۶ء میں یہ آگے بڑھی تھی!

دسواں باب[۱]

تجاویز دہلی، نہرو رپورٹ، چودہ نکات

پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ کانگرس کے مہا سبھائی ممبروں کی ذہنیت سے مسلمانوں کے انتہا پسند لیڈر برداشتہ خاطر رہنے لگے تھے لیکن ابھی انہوں نے کانگرس سے اپنا رشتہ نہیں توڑا تھا کچھ دنوں وہ برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندو مسلم اتحاد ہو جائے اس اتحاد کی ضرورت اُسوقت اس لئے اور زیادہ محسوس ہو رہی تھی کہ اسی سال ہندوستان کے لئے پارلیمنٹ میں جدید دستور کا خاکہ مرتب کیا جا رہا تھا اور یہ غور ہو رہا تھا کہ اس نئے دستور میں جو سیاسی اصلاحات ہندوستان کو دی جائیں ان کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ اس نوعیت کا انحصار چونکہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندؤں اور مسلمانوں کے آپس کے تعلقات پر تھا اس لئے کوشش یہ تھی کہ کم سے کم سیاسی مسائل اور مفاد مشترک پر ہی ان دونوں کو متحد کر دیا جائے۔ تاکہ آپس کا اختلاف حکومت کے لئے عذر لنگ نہ بن جائے چنانچہ کئی یونٹی کانفرنسیں ہوئیں مگر ناکام رہیں سنہ ۱۹۳۲ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے نام سے بھی ایک آخری کوشش ہوئی لیکن حشر اس کا بھی وہی ہوا جو اس سے پہلی کوششوں کا ہوا تھا۔ اتحاد کی کوششوں میں ان متواتر ناکامیوں کے بعد جب

حالات پر انتہا پسندوں کو مطلق قابو نہ رہا۔ تو مجبوراً انہیں اس موقع پر اپنی قوم کے ان اعتدال پسندوں کا سہارا لینا پڑا جنہیں یہ خود پلیٹ فارم سے ہٹا چکے تھے۔ اور اس مسلم جماعت کو دوبارہ زندہ کرنا پڑا جسے رجعت پسند کا خطاب دیکر یہ خود ختم کر چکے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء کے اسمبلی سیشن کے زمانہ میں مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں مسلم لیگ کا اجلاس دہلی میں طلب کیا گیا اور اس اجلاس میں ملک کے اہم سیاسی معاملات پر خالص مسلمانوں کے سیاسی نقطہ نظر سے غور و خوض کرنے کے بعد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے متعلق چند تجاویز منظور کر لی گئیں۔ جو کانگریس اور ہندوؤں سے سیاسی اتحاد کی گفتگو کے سلسلہ میں بطور بنیاد کام دے سکیں۔ ان تجاویز میں انتخاب کے مسئلہ کو مشروط انداز میں طے کیا گیا تھا یعنی اس طرح کہ اگر مسلمانوں کی یہ تجاویز منظور کر لی گئیں تو مسلمان معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے۔ تجاویز دہلی اختصار کے ساتھ یہ تھیں۔

(۱) سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔

(۲) سرحد اور بلوچستان کو وہی اصلاحات دی جائیں، جو اور صوبہ کو ملیں۔

(۳) پنجاب اور بنگال میں مسلم نمائندگی تناسب آبادی کے لحاظ سے منظور کی جائے۔

(۴) مرکز میں مسلمانوں کو کل ایوان میں ۱/۳ نشستیں دی جائیں۔

(۵) مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندو اقلیت کو وہی رعائتیں دی جائیں جو ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیت کو حاصل ہوں۔

(۶) اگر ان سب تجاویز کو منظور کر لیا جائے تو مسلمان نشستوں کے تعین کے ساتھ مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے۔

ان تجاویز کو مولانا محمد علی نے کانگرس ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا جس نے کسی قدر تامل اور بحث و تمحیص کے بعد انہیں منظور کر لیا اس کے بعد یہی تجاویز مدراس کانگرس کے سالانہ اجلاس میں پیش ہوئیں اور وہاں بھی تقریباً سب کی سب منظور ہو گئیں اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد ایک آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی جسے ملک کے لئے جدید دستور کا خاکہ تیار کرنے کا کام سپرد کر دیا گیا۔ حالات اس نوبت پہ تھے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے "سائمن کمیشن" کو ہندوستان بھیجنے کا اعلان کیا تا کہ وہ ملک کے حالات کا مطالعہ کر کے یہ سفارش کرے کہ ہندوستان کے لئے جو دستور اساسی تیار کیا جائے اس کی نوعیت کیا ہونی چاہیئے۔ کانگرس نے اس کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر دیا۔ عذر یہ تھا کہ ہندوستان کے لئے دستور کی نوعیت کا تعین غیر ہندوستانی نہیں کر سکتا مسلم لیگ نے بھی مسٹر محمد علی جناح کی رہنمائی میں کانگرس کا ساتھ دیا۔ اس لئے کہ حکومت نے اس کمیشن میں کسی ہندوستانی کو شامل نہیں کیا تھا اور ہندوستانی نقطہ نظر کو سامنے رکھے بغیر دستور کی نوعیت کا تعین نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پہ مسلمانوں کے ایک مختصر سے گروہ نے سر محمد شفیع کی قیادت میں مسلم لیگ کے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے سائمن کمیشن کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سال مسلم لیگ کا اجلاس دو مقامات پہ ہوا ایک لاہور میں جس کے صدر سر محمد شفیع تھے ایک کلکتہ میں جس کی صدارت سر محمد یعقوب نے کی۔ کلکتہ والے اجلاس میں دہلی کی تجاویز کا اعادہ کیا گیا اور سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا گیا۔ قوم پرور مسلمانوں کے اس طرز عمل سے کانگرس کے ساتھ مسلمانوں کا اختلاف بڑھنے نہ پایا اور فضا کسی قدر درست ہو گئی۔ لیکن حکومت کے عہدہ داروں کو یہ فیصلہ برا معلوم ہوا چنانچہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کے اس فیصلہ سے بگڑ کر لارڈ برکن ہڈ نے پارلیمنٹ میں ایک تقریر کرتے

ہوئے ہندوستانیوں کو چیلنج کیا کہ اگر وہ حکومت کے مقرر کردہ کمیشن کا بائیکاٹ کرتے ہیں تو خود ہی ہندوستان کے لئے ایک مناسب دستور کا خاکہ تیار کر کے دکھا دیں۔ ہندوستانیوں نے فوراً اس چیلنج کو منظور کر لیا اور دستور جدید کی تدوین کا کام پوری سرگرمی سے شروع ہو گیا۔

فروری ۱۹۲۸ء میں ایک طرف انگلستان کی مزدور حکومت کا مقرر کردہ کمیشن حالات کے مطالعہ کے لئے ہندوستان پہونچا اور دوسری طرف ہندوستان میں آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس شروع ہو گئے۔ ان اجلاسوں میں ہندوستان کے دستور اساسی کی تدوین کا اصول تو طے ہو گیا لیکن فرقہ وارانہ اختلافات کا حل نہ ہو سکا کیونکہ اس نوبت پر ہندو مہا سبھا پوری قوت کے ساتھ مسلمانوں کے مقابل ہو گئی تھی اور وہ دہلی کی منظور کردہ تجاویز پر مسلمانوں سے معاملہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اُسے خصوصیت کے ساتھ سندھ کی علحدگی اور پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے مسلم نمائندگی پر اعتراض تھا۔ اور پنجاب کے سکھ بھی اس معاملہ میں مہاسبھا کے ساتھ تھے چنانچہ مسلم لیگ اور مہاسبھا میں یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ آل پارٹیز کانفرنس اسے سلجھا نہ سکی۔

لیکن جدید دستور کا خاکہ چونکہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا تھا جب تک فرقہ وار گتھی نہ سلجھ جائے اس لئے کانگریس نے اس کام کے لئے آل پارٹیز کانفرنس کے ماتحت ایک نمائندہ کمیٹی بنائی جس کا صدر پنڈت موتی لال نہرو کو مقرر کیا اور دستور اساسی کی تدوین کا کام اس کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ اس کمیٹی میں دو نمائندے مسلمانوں کے دو ہندو مہاسبھا کے اور ایک ایک نمائندہ سکھوں، لبرلوں اور غیر برہمن طبقہ کا تھا۔ اس کمیٹی نے فی الفور اپنا کام شروع کر دیا اور اگست ۱۹۲۸ء کے آخری ہفتہ اپنی رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں پیش

کردی۔ یہی رپورٹ "نہرو رپورٹ" کے نام سے موسوم ہے۔

لکھنؤ آل پارٹیز کانفرنس میں مسلم لیگ خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء کے کچھ نمائندے شریک تھے جنہوں نے بے سوچے سمجھے اس کی منظوری دیدی اور کانفرنس کا اجلاس بہ خیر و خوبی ختم ہو گیا لیکن ابھی اس کانفرنس کا اجتماع منتشر نہ ہونے پایا تھا کہ بعض ذمہ دار مسلمانوں کی طرف سے اس رپورٹ کی مخالفت کا طوفان اٹھا اور ان حضرات پر جنہوں نے اس رپورٹ کو مسلمانوں کے نام سے منظور کر لیا تھا ہر طرف سے لعنت ملامت کی بوچھار ہونے لگی۔ یہ نہرو رپورٹ کیا تھی؟ —— ہندو راج کا مکمل خاکہ تھا جس میں مسلم انفرادیت کی ہر ممکن زاویہ سے نفی کی گئی تھی۔ اور ملک کے ہر شعبہ میں ہندو اقتدار کو مستحکم بنا دیا گیا تھا!

سوال ہوا کہ اس رپورٹ ساز کمیٹی کے مسلم اراکین آخر کیا کر رہے ہیں انہوں نے اس رپورٹ پر کیوں دستخط کر دیئے؟ اسوقت یہ عقدہ کھلا کہ اس کمیٹی کے دو مسلم ارکان میں سے ایک شعیب قریشی نے :۔

"مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حمایت کرتے ہوئے نہایت قابلیت معقولیت اور جرأت کے ساتھ پنڈت موتی لال نہرو کی تجاویز سے اختلاف کیا تھا لیکن جب پنڈت جی نے ان کو نہ مانا تو وہ پھر کمیٹی کے کسی جلسے میں شریک ہی نہیں ہوئے اور فوراً الہ آباد سے بمبئی واپس چلے گئے۔

انہوں نے کمیٹی سے اختلاف کرتے ہوئے ایک بیان بھی لکھا تھا لیکن پنڈت موتی لال نہرو نے وہ اختلافی بیان رپورٹ کے ساتھ شائع نہیں کیا،" اور مولانا کفایت اللہ صاحب اس سے بھی

زیادہ صفائی کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں
کہ مسٹر شعیب قریشی نے ان سے یہ کہا تھا کہ انہوں نے (یعنی شعیب
قریشی نے) نہرو رپورٹ پر اپنے دستخط نہیں کئے ہیں لیکن اس کے
متعلق انہوں نے اپنے لبوں پر اس لئے مہر سکوت قائم رکھی کہ ایسا
نہ کرنے سے رپورٹ کی اہمیت ختم ہو جاتی تھی اور سر علی امام کے متعلق
جو اس رپورٹ ساز کمیٹی کے دوسرے مسلم ممبر تھے مولانا کفایت اللہ
کا بیان ہے کہ انہوں نے رپورٹ پر دستخط تو کر دیئے تھے لیکن اسے
پڑھا نہ تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں جب یہ رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس کے
اجلاس میں پیش ہوئی تو سر علی امام نے اس کی حمایت میں جو تقریر
کی اس کا بڑا حصہ ان تجاویز سے مختلف تھا جو مسلمانوں کے متعلق
نہرو رپورٹ میں شائع کی گئی تھیں (دی کیس آف دی مسلم صہ؟)
اس بیان سے نہرو کمیٹی کے مسلم ارکان کی پوزیشن تو ایک حد تک صاف ہو گئی
لیکن ہندو مسلم اختلافات اور زیادہ بڑھ گئے۔ اگرچہ نہرو رپورٹ کی اس عام مخالفت
کو دور کرنے کے لئے کچھ دنوں بعد کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس بھی طلب
کیا گیا لیکن یہ اجلاس بھی ناکام رہا اور مسلمانوں کو نہرو رپورٹ سے جو شکایتیں تھیں
وہ بدستور باقی رہیں۔ کانگرس کے ہندو ممبروں کی اس ذہنیت کا اثر مسلمانوں
کے ان انتہا پسند لیڈروں پر جواب تک کانگرس کے ساتھ تھے یہ پڑا کہ انہوں نے
علانیہ اس جماعت سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا اور کانگرس سے علحدہ ہو گئے۔

مسلم لیڈروں کے کانگرس سے علحدہ ہوتے ہی مسلم سیاست میں گویا جان
سی آگئی اور ہر طرف سے یہ کوشش ہونے لگی کہ اب مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوں

اور سیاسی مطالبات میں متحد ہو جائیں چنانچہ اس خواہش مشترک کا ظہور وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس تھی، جو ۳۱ دسمبر ۱۹۲۸ء کو سر آغا خاں کی زیر صدارت دہلی میں منعقد ہوئی۔ اور جس میں جمعیۃ العلماء، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ کے سربرآوردہ لیڈروں کے علاوہ مرکزی اور صوبوں کی مجالس قانون کے ممبر بھی شریک تھے۔ اس اجلاس نے پوری قوت سے نہرو رپورٹ کی مذمت کی اور تجاویز دہلی کی بنیادوں پر لیکن مخلوط انتخاب کے ذکر کو محو کر کے ایک طویل قرارداد مرتب کی جس میں تفصیل سے مسلمانوں کے شہری اور سیاسی حقوق کا احاطہ کیا تھا اور حکومت سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے دستور اساسی میں ان کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔

اس قرارداد کی خلافت کمیٹی جمعیۃ العلماء اور مسلم لیگ تینوں جماعتوں کے لیڈروں نے حمایت کی اور کانفرنس کے اجلاس میں یہ بالاتفاق پاس ہوا۔ ان ہی دنوں کلکتہ میں کانگرس کا سالانہ اجلاس تھا اس اجلاس میں جب نہرو رپورٹ پیش کی گئی تو اس کی ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے بھی مخالفت ہوئی اس لئے اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ نہرو رپورٹ ایک برس بعد کانگرس کے اجلاس میں پیش کی جائے اگر اس وقت ملک کی فضا درست ہو جائے تو اسے منظور کر لیا جائے گا

مسلم کانفرنس کے اس اجلاس کے بعد مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلمانوں کے مطالبات کو منظم صورت میں حکومت اور کانگرس کے آگے پیش کرنے کے لئے دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت مسٹر محمد علی جناح نے کی۔ اسی اجلاس میں وہ اختلاف بھی دور ہو گیا جو سائمن کمیشن کی حمایت اور مخالفت کے باعث مسلمانوں میں پیدا ہو گیا تھا اور سر محمد شفیع کی جماعت جو لیگ سے علیحدہ ہو گئی تھی وہ پھر لیگ میں آملی۔ اس اجلاس میں محمد علی جناح نے نہرو رپورٹ پر نہایت سخت

تنقید کی اور اسے مسلم تجاویز دہلی کے مقابلہ میں ہندو تجاویز سے تعبیر کیا اسی کے ساتھ مسلمانوں کے بنیادی حقوق پر بڑی تفصیل اور جامعیت سے روشنی ڈالی اور مستقبل کے ہندوستان میں مسلم انفرادیت کے تحفظ کے لئے ایک طویل تجویز میں وہ مشہور چودہ نکات پیش کئے جو آج تک مسلمانوں کے قومی مطالبات سمجھے جاتے ہیں وہ نکات یہ ہیں :-

(۱) آئندہ دستور ہند کی شکل وفاقی ہوگی۔

(۲) صوبوں کو کامل خود مختاری حاصل ہوگی اور ہندوستان کے تمام صوبوں کو بلا کسی استثنار کے اصلاحات دی جائیں گی۔

(۳) ملک کی تمام مجالس قانون ساز کی ترتیب اس معین اصول پر ہوگی کہ ہر صوبہ میں اقلیتوں کو کافی اور موثر نیابت حاصل رہے۔ لیکن کسی اکثریت کو گھٹا کر اقلیت یا مساوات کے درجے تک نہ پہونچایا جائے۔

(۴) مرکزی مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی نیابت (⅓) ایک تہائی سے کم نہ ہو۔

(۵) فرقہ وار گروہوں کی نمائندگی و نیابت بطریق جداگانہ انتخاب ہوگی جس طرح اب ہوتی ہے البتہ ہر قوم مجاز ہوگی کہ اپنی خوشی سے اپنے اس قانونی حق سے خود دست بردار ہو جائے۔

(۶) ہندوستانی صوبوں کی تقسیم میں آئندہ کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جائے گی جس کا اثر صوبہ سرحد، پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریتوں پر پڑے۔

(۷) تمام ملتوں کے لئے ضمیر و مذہب کی آزادی۔ یعنی عقیدہ و تلقین کی

آزادی، عبادت و رسوم کی آزادی تعلیم و تبلیغ کی آزادی تنظیم و اجتماع کی آزادی کی ضمانت کی جائے۔

(۸) کوئی مسودہ قانون، قرارداد یا تحریک کسی مجلس قانون ساز میں منظور نہ ہو سکے گی اگر کسی قوم کے (۳/۴) تین چوتھائی ممبران مجلس اس کو اپنے قومی مفاد کے خلاف قرار دیں۔

(۹) سندھ کو بغیر کسی شرط کے صوبہ بمبئی سے علحدہ کر کے ایک جدید صوبہ بنایا جائے۔

(۱۰) صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے مساوی اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(۱۱) سلطنت کے ذمہ دار عہدوں اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو دوسری قوموں کے پہلو بہ پہلو صلاحیت و کارکردگی کا لحاظ رکھتے ہوئے مناسب حصہ دیا جائے۔

(۱۲) دستور اساسی میں ایسے کافی تحفظات رکھے جائیں جن کی رو سے اسلامی کلچر اسلامی تہذیب و تمدن کی حفاظت و ترقی اور مسلم تعلیم و زبان، رسم الخط و مذہب پر سپرسنل لا اور اسلامی اداروں کی ترقی و حمایت کے لئے سلطنت اور سلطنت کے دوسرے اداروں سے گرانٹ میں مناسب حصہ حاصل کیا جا سکے۔

(۱۳) کسی صوبہ کی کابینہ وزارت کم از کم ۱/۳ مسلم نیابت کے بغیر ترتیب نہ دی جائے یعنی ہر وزارت کی ترتیب میں ۱/۳ مسلم وزیروں کی شمولیت ضروری ہوگی۔

(۱۴) دستور اساسی میں کوئی ترمیم یا تبدیلی اسوقت تک نہ کی جائیگی

جب تک وفاق ہند کے سارے ممبر یعنی ہندوستان کے صوبے اور دیسی ریاستیں اس کو تسلیم نہ کر لیں۔

❋

مسلم لیگ کے اس اجلاس سے پہلے مسٹر محمد علی جناح ان لوگوں میں تھے جو نہرو رپورٹ میں ترمیم کے حامی تھے اور یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے مطالبات کی روشنی میں اس رپورٹ پر نظر ثانی کر کے اسے دوبارہ ملک کے آگے پیش کیا جائے چنانچہ جب کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس طلب کیا گیا تھا تو مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس بھی وہیں قرار پائے تھے اور کنونشن میں خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا محمد علی نے اور مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر محمد علی جناح اور مسٹر چھاگلا وغیرہ نے شرکت کی تھی مولانا محمد علی تو ڈومنین اسٹیٹس اور آزادی کامل پر بحث کے دوران ہی میں ناراض ہو کر کنونشن کے اجلاس سے اٹھ آئے تھے مگر مسٹر محمد علی جناح نے اس اجلاس میں نہایت تفصیل سے مسلمانوں کا نقطہ نظر پیش کیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اس روشنی میں نہرو رپورٹ پر نظر ثانی کی جائے لیکن کانگرس کے ہندو ممبروں نے مسٹر محمد علی جناح کی سختی سے مخالفت کی اور نہرو رپورٹ پر کسی قسم کی نظر ثانی کرنے سے انکار کر دیا۔ ہندوؤں کی اس ذہنیت سے متاثر ہو کر مسٹر محمد علی جناح بھی بالآخر رپورٹ کے مخالفین کی صف میں آ گئے اور نہرو رپورٹ کے مقابلہ میں مسلم لیگ کے اجلاس میں اپنی طرف سے یہ چودہ نکات پیش کئے جو اوپر تفصیل سے بیان ہو چکے ہیں۔

گیارہواں باب

ڈومینین اسٹیٹس اور آزادی کامل کی کشمکش

ہندوستان کی سیاسی جماعتیں اپنے قیام کے وقت اپنا ایک مخصوص نصب العین بھی متعین کرتی رہیں جو ان کی سیاسی جدوجہد کی منزل مقصود ہوا کرتی تھی لیکن یہ نصب العین ملک کے حالات کی تبدیلی افراد کی سیاسی بصیرت اور جماعتوں کے سیاسی تجربات کے ساتھ ساتھ برابر بدلتا رہا۔ مثلاً ابتدا میں کانگریس کا مطمح نظر ملک کے نظم ونسق کی اصلاح تھا۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں سلف گورنمنٹ ہوا۔ سنہ ۱۹۱۶ء سے سنہ ۱۹۲۰ء تک ہوم رول اور سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک سوراج اور سنہ ۱۹۲۹ء میں مکمل آزادی قرار پایا۔ اسی طرح مسلم لیگ کا ابتدائی نصب العین ملک کے نظم ونسق میں مسلمانوں کا مناسب حصہ تھا۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں "بلحاظ حالات حکومت خود مختاری ہوا"۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں برادران وطن سے اتحاد۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں مکمل ذمہ دار حکومت اور اس کے بعد آزادی کامل۔

اسی طرح خلافت کمیٹی اور جمعیۃ العلماء ہند کا نصب العین بھی کامل آزادی مقرر ہوا تھا۔

سنہ ۱۹۲۷ء کے کانگریس کے اجلاس مدراس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے جو ریزولیوشن [illegible]

سفر سے نئے نئے واپس ہوئے تھے آزادی کامل کی قرارداد پیش کی تھی جسے کانگریس نے اسوقت بجنسہ منظور نہیں کیا تھا لیکن اسے اپنی آخری سیاسی منزل قرار دے لیا تھا اس کے بعد جب نہرو رپورٹ پیش ہوئی تو انتہا پسندوں کو اس پر سب سے بڑا اعتراض یہی تھا کہ اس کی ترتیب میں آزادی کامل کے عقیدے کا مطلق لحاظ نہیں رکھا گیا اور جو خاکہ پیش کیا گیا ہے وہ ڈومنین اسٹیٹس کے ابتدائی درجہ کا ہے چنانچہ مسلمانوں کی طرف سے نہرو رپورٹ کی مخالفت ہوئی اور اس مخالفت کو دور کرنے کے لئے کلکتہ میں آل پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا تو اس میں بھی یہی بحث پیدا ہوئی کہ کانگریس کا عقیدہ کیا ہے ڈومنین اسٹیٹس یا آزادی کامل۔ اس بحث کے دوران میں کانگریس کے ہندو ممبروں کی ذہنیت کا جو مظاہرہ ہوا اسی نے مولانا محمد علی مرحوم کو بددل کر دیا تھا اور وہ کنونشن کے اجلاس سے اٹھ کر چلے آئے تھے۔ یہ ذہنیت کیا تھی؟ عقیدہ رکھا جائے آزادی کامل کا لیکن اگر حکومت کی طرف سے ڈومنین اسٹیٹس کا ابتدائی درجہ بھی مل جائے تو اسے قبول کر لیا جائے۔

لیکن واقعہ تو یہ ہے کہ سوراج، ڈومنین اسٹیٹس، ذمہ وار حکومت درجہ نو آبادیات، اور آزادی کامل کی اصطلاحیں اس قدر عجیب ہیں اور ایسے عجیب انداز سے ہندوستان کی سیاست میں استعمال ہوتی رہی ہیں کہ کبھی ان کا صحیح مفہوم ہی متعین نہ ہو سکا۔

سوراج کا مفہوم کانگریس کے نزدیک اس سے زیادہ کبھی اور کچھ نہ ہوا کہ ہندوستان کے داخلی انتظام میں ہندوستانیوں کو بھی حصہ مل جائے۔ یہی مفہوم ڈومنین اسٹیٹس ذمہ وار حکومت اور درجہ نو آبادیات کا بھی ہے۔ البتہ آزادی کامل کا عقیدہ اختیار کرنے کے بعد اولاً طرز حکومت کے یہ مدارج ختم ہو جاتے ہیں

اور پھر سوال مطالبہ کا باقی نہیں رہتا بلکہ جد و جہد کا رہ جاتا ہے۔ لیکن کانگرس نے آزادی کامل کا عقیدہ قبول کر لینے کے بعد بھی حکومت سے نہرو رپورٹ کے ذریعہ جس طرز حکومت کا مطالبہ کیا تھا اور اس کی جو تاویل صاحب رپورٹ نے کانگرس کے اجلاس میں پیش کی تھی وہ یہ تھی کہ عقیدہ تو بیشک ہمارا آزادی کامل ہی ہے لیکن اس تک پہنچنے کے لئے ابتدائی سیڑھیاں بھی ہمیں طے کرنے کی ضرورت ہے اور نہرو رپورٹ ان ابتدائی سیڑھیوں میں سے ایک ہے۔ اس تاویل کے صاف معنی یہ ہیں کہ کانگرس نے آزادی کامل کا عقیدہ تو قبول کر لیا ہے لیکن ملک ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔ اور فی الحقیقت اس وقت کے حالات کے اعتبار سے یہ بہت صحیح رائے تھی لیکن بعض انتہا پسند اور جوشیلے افراد جن میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ تھے کانگرس کے ساتھ محض اس لئے ہو گئے تھے کہ آزادی کامل اس کا مطمح نظر ہے اور اس کی سیاسی جد و جہد کا مفہوم صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح ملک سے بدیشی حکومت کو نکال باہر کرے۔ حالانکہ بدیشی حکومت کو فی الفور ہندوستان سے باہر کر دینے کا اس وقت تک کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا جب تک ہندوستانی حکومت کے ہر شعبہ کو چلانے اور بیرونی حملوں سے ملک کی مدافعت کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ اور یہ قابلیت ان میں سیاسی بصیرت اور متواتر تجربوں ہی سے آ سکتی تھی اور اس قسم کا موقع انہیں اسوقت مل سکتا تھا جب ہندوستان کی ساری قومیں اس پر متحد بھی ہو جائیں۔

ہندوستان کی قوموں کا ملک کی "آزادی کامل" پر اتحاد شرط اولین ہے لیکن یہ شرط اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب اس راہ میں قدم اٹھاتے وقت ہر قوم کی سیاسی انفرادیت کے محافظت کی ضمانت بھی کر دی جائے کیونکہ "آزادی کامل"

تک پہونچنے کے لئے راہ میں جو منزلیں آتی ہیں وہ سب آئینی ہیں انقلابی نہیں، اس لئے ان آئینی منزلوں تک کا راستہ بالکل آئینی حیثیت سے طے ہونا چاہئے۔ اور ابتدا ہی میں ان مختلف اقوام کو جو اس راہ پر گامزن ہوں گی آئینی حیثیت سے یہ طمانیت مل جانی چاہئے کہ اس راہ کی منزل آخر تک پہونچتے پہونچتے جو بالکل انقلابی ہے ہر قوم کی انفرادیت اور اس کا سیاسی مفاد قطعاً محفوظ رہے گا ــــــــــ یہ طمانیت ہندوستان کی مختلف قوموں کو نہیں ملی۔ بلکہ ابتدائی آئینی منزل بھی (نہرو رپورٹ) جو اس لمبے سفر کی متعین کی گئی اس میں بھی ان مختلف قوموں کو جو ہم سفر تھیں بالکل نظر انداز کردیا گیا۔ جس کے باعث ملک میں انتشار پیدا ہوا اور وہ ساری سیاسی جدوجہد ایک مخصوص قوم کی کشمکش اقتدار بن کر رہ گئی۔

یہ نتیجہ غیر متوقع نہیں تھا، بلکہ ہندوؤں کی اس ذہنیت کا جو کانگریس کے اندر اور باہر ظاہر ہوا یہ قدرتی ردعمل تھا۔ جس کو کانگریس کے ذمہ دار لیڈروں نے بھی محسوس کیا اور اس جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے سے بچانے اور اس کی قومی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے لاہور کے اجلاس میں ایک اور ہنگامہ خیز اقدام کیا جس نے بعض افراد کو جو سیاست اور اس کی چالوں سے بے خبر مگر جوشیلے اور آزادی کے شیدائی تھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ اقدام "آزادی کامل" کو بطور نصب العین اختیار کرنا تھا۔

۱۹۲۹ء میں جب ملک میں نہرو رپورٹ کے خلاف ہنگامہ برپا تھا، اس وقت کے وائسرائے لارڈ ارون نے کانگریس کا یہ منشا پاکر کہ اس کا منزل مقصود ملک کے اندرونی انتظام میں دخل حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ حکومت برطانیہ سے لندن جاکر مشورہ کیا اور ہندوستان واپس آکر اسمبلی میں ایک بیان دیا۔

جس میں صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ "ڈومنین اسٹیٹس" سے حکومت برطانیہ کی مراد کامل درجہ نوآبادیات ہے اور اسے طے کرنے کیلئے ہندوستانی افراد کی ایک گول میز کانفرنس لندن میں طلب کی جائے گی۔ وہی لفظوں کا گورکھ دہندہ ایک خاص طرز حکومت جس کا تعلق اندرونی ملک کے محض چند شعبوں کے انتظام سے ہو، اس کا نام چاہے ڈومنین اسٹیٹس رکھ لیجیے یا درجہ نوآبادیات لیکن کانگرس اس اعلان سے خوش ہوگئی۔ اور اس نے وائسرائے کی خدمت میں فوراً ایک عرضداشت ارسال کی جس میں وائسرائے کے اعلان کا شکریہ ادا کیا اور گول میز کانفرنس میں اپنی شرکت کا عزم ظاہر کیا گیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ ہندوستان کے آئندہ طرز حکومت کے متعلق کانگرس نے جو اصول طے کیا ہے (نہرو رپورٹ) اس کا لحاظ رکھا جائیگا۔

اس عرضداشت کے جواب میں وائسرائے کو فوراً کانگرس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ گول میز کانفرنس میں کوئی طے شدہ چیز پیش نہ ہوگی بلکہ ہر خیال کے نمائندوں سے تبادلہ خیال کے بعد ایک اصول متعین کیا جائیگا اور یہ ابھی سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اصول کیا ہوگا بہر حال جو کچھ ہوگا وہ نمائندوں کی رائے سے ہوگا چاہے اس کی نوعیت نیچی ہو یا اونچی لیکن منزل مقصود ہندوستان کی ڈومنین اسٹیٹس ہی ہوگی۔ غرض کانگرس چاہتی تھی کہ سودا گول میز کانفرنس سے پہلے ہی طے ہو جائے اور حکومت مصر تھی کہ چار آدمیوں کے بیچ میں یہ طے ہو کہ ہندوستان کی قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ جب اس بحث و تمحیص کا نتیجہ کانگرس کے حق میں نہ نکلا تو کانگرس کے ذمہ دار افراد نے ایک اور چال چلی محض حکومت پر دباؤ ڈالنے اور دوسری طرف مخالفین نہرو رپورٹ کا منہ بند کرنے اور جوشیلے طبقہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے لاہور کے سالانہ اجلاس میں نہرو رپورٹ کو

مسترد کر دیا اور "آزادی کامل" کی قرارداد منظور کرلی۔ چال کامیاب رہی۔

مسلمان اگرچہ اس اجلاس کے بعد من حیث الجماعت کانگرس سے بالکل علیحدہ ہو چکے تھے لیکن آزادی کامل کی قرارداد کے بعد، جمعیۃ العلماء جو اپنے مسلک کے اعتبار سے کبھی بھی آئینی جماعت نہیں تھی، اور ہمیشہ سے انقلابی جماعت رہی تھی پھر کانگرس کے ساتھ ہو گئی۔ اور اس جماعت کے علاوہ بھی چند مسلمان افراد تھے جنہوں نے کانگرس کے ساتھ رہنا پسند کیا اور یہ مسلمان وہ تھے جو اپنے آپکو "نشنلسٹ" سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ حکومت پر بھی کچھ دباؤ پڑا اور اس نے کسی قدر جھک کر کانگرس سے معاملہ کر لیا۔

بارہواں باب[۱۲]
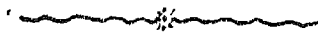
نشلسٹ، احرار، خدائی خدمتگار

مسلمانوں کے چند افراد جو کانگرس کی مہاسبھائی ذہنیت کا متعدد مرتبہ تجربہ کرنے کے بعد بھی، کانگرس کے وفادار رہتے آئے ہیں اپنے آپ کو "نشلسٹ" کہتے ہیں۔ یہ جماعت اگرچہ قیام کانگرس کے بعد ہی سے اس میں شریک چلی آتی ہے لیکن اس کے وجود کا باقاعدہ اعلان ۱۹۲۹ء ہی میں ہوا۔

جنوری ۱۹۲۹ء کی آخری تاریخوں میں اس جماعت کی باقاعدہ تشکیل ہوئی، صدر مولانا ابوالکلام آزاد سکرٹری تصدق احمد خاں شیروانی اور خزانچی ڈاکٹر انصاری منتخب ہوئے۔ اور اس جماعت کا نصب العین:۔

"مسلمانوں میں حب وطن پیدا کرنا تاکہ وہ فرقہ پرستی سے بالاتر ہو کر سیاسی جدوجہد میں شریک ہوں۔ اور اکثریت اور اقلیت کے درمیان ایسے تعلقات پیدا کرنا جو حقوق کے متعلق آپس کے اختلافات کو ختم کر دیں"

قرار پایا۔ اس جماعت نے ہندو مسلم مسئلہ کو حل کرنے کی یہ تجویز سوچی تھی کہ معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب، اور انتخاب میں ہر بالغ ہندوستانی کو رائے

دینے کا حق حکومت سے تسلیم کرایا جائے۔ ۱۹۳۱ء تک اس پارٹی کے تین جلسے بھی ہوئے لیکن اسے مسلمانوں میں مطلق مقبولیت حاصل نہیں ہوئی اور یہ حیثیت جماعت یہ ۱۹۳۱ء کے بعد ختم ہوگئی۔ نہرو رپورٹ کی یہ جماعت حامی اور کانگرس کی مددگار تھی۔

نشلسٹ پارٹی کے علاوہ ۱۹۲۹ء میں تین اسلامی جماعتیں اور عالم وجود میں آئیں۔ احرار، خدائی خدمتگار، اور جمعیۃ العلماء ہند (کانپور)

احرار کے نام سے پنجاب خلافت کمیٹی کے ارکان پر مشتمل ایک ایسی جماعت قائم ہوئی جو سیاست میں کانگرس کی پیرو اور مذہبی معاملات میں "قاضی" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جماعت نے ملکی مسائل میں چونکہ کانگرس کو اپنا 'امام' بنایا تھا اس لئے نہرو رپورٹ کو مسترد کرنے کے بعد جب کانگرس نے آزادی کامل کا اعلان کر دیا تو یہ جماعت بھی سول نافرمانی میں کانگرس کے ساتھ ہوگئی۔ اور جب سول نافرمانی ختم ہوگئی تو انہوں نے کشمیر ایجی ٹیشن میں حصہ لیا اور بعد میں مرزائیت کے خلاف مورچہ لگایا اور لکھنؤ میں مدح صحابہ کا شاخسانہ چھیڑ دیا۔

اس جماعت کا سیاسی مسلک دراصل وہی ہے جو مولوی سید احمد بریلوی کی جماعت کا تھا۔ اور مذہبی معاملات میں احتساب کا انداز بھی ان کا بالکل وہی ہے البتہ اس زمانہ میں اعلان جہاد ہوا کرتا تھا اس زمانہ میں احرار ایجی ٹیشن کا اعلان کرتے ہیں۔

مسلک کے اعتبار سے اس میں اور جمعیۃ العلماء میں کوئی خاص فرق نہیں ہے سوائے اس کے کہ جمعیۃ العلماء مذہبی مداخلت کے مسئلوں میں صرف فتوے صادر کیا کرتی ہے اور یہ عملاً ان کی تعمیل کرتی ہے۔ اس جماعت نے عام مسلمانوں کی ذہنیت پر جو خاص اثر ڈالا ہے اس کا ذکر آگے آئیگا۔

دوسری جماعت خدائی خدمتگاروں کی ہے یہ جماعت "سرحدی گاندھی"

یعنی خان عبد الغفار خاں نے ۱۹۲۹ء میں قائم کی تھی اور اس کا مسلک بھی یہی تھا کہ سیاسی جدوجہد میں کانگرس کا ساتھ دیا جائے چنانچہ ۱۹۲۹ء میں جب کانگرس نے مکمل آزادی کا اعلان کیا تو احرار اور جمعیۃ العلماء کی طرح یہ جماعت بھی کانگرس کے ساتھ ہو گئی۔ سرحدی پٹھانوں کو کانگرس کی جنگ میں کھینچ لانا اور ہندو گروہ کے اصول پر چلا دینا خان عبد الغفار خاں کا بڑا کارنامہ ہے۔ لیکن اس سے ان پٹھانوں کی ذہنیت پر جو اثر پڑا وہ بہت افسوسناک ہے اس پر کسی دوسری جگہ گفتگو کی گئی ہے۔

تیسری جماعت جو ۱۹۲۹ء میں قائم ہوئی وہ جمعیۃ العلماء ہند کانپور ہے نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد سب مسلم جماعتیں کانگرس سے علیحدہ ہو گئیں انہی میں جمعیۃ العلماء ہند بھی تھی۔

لیکن کچھ دنوں بعد جب کانگرس نے "آزادی کامل" کی قرارداد اپنے سالانہ اجلاس میں پیش کی تو علماء نے بھی اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرنے کا ارادہ کیا۔ آزادی کامل کی قرارداد کے بعد اکثر علماء کی توجہ پھر کانگرس کی طرف ہو گئی تھی لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو دوبارہ کانگرس کی شرکت کے خلاف تھے۔ چنانچہ علماء میں پھوٹ پڑی ایک گروہ نے امروہہ میں مولانا معین الدین کی صدارت میں اپنا جلسہ کیا اور یہ اعلان کر دیا کہ جمعیۃ العلماء کانگرس کے ساتھ ہے اور دوسرے گروہ نے کانپور میں اپنا جلسہ کیا اس کے صدر مولانا محمد علی تھے اس اجلاس نے یہ فیصلہ کیا کہ مسلمان کانگرس سے علیحدہ رہیں اور جو سیاسی تحریک کانگرس شروع کرنے والی ہے اس میں مسلمان حصہ نہ لیں۔ گویا ۱۹۲۹ء میں جمعیۃ العلماء کی دو شاخیں ہو گئیں اور دونوں نے اپنا نام جمعیۃ العلماء قائم رکھا۔ اس پھوٹ کے بعد پھر جمعیۃ العلماء کے نام سے کوئی جماعت مسلمانوں میں بااثر نہیں رہی بلکہ

ان دونوں کی آپس کی لڑائی نے اخلاقی حیثیت سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہونچایا۔

غرض ۱۹۳۰ء میں جب کانگرس نے اپنے سول نافرمانی کے پروگرام کا جائزہ لینا شروع کیا تو مسلمانوں کی قدیم سیاسی جماعتوں میں سے ایک بھی اس کے ساتھ نہ ہوئی۔ اور نہ مسلمان من حیث القوم اس تحریک میں شامل ہوئے البتہ احرار اور جمعیتہ العلماء کی مختصر سی جماعتیں گاندھی اروِن سمجھوتے تک کانگرس کے ساتھ رہیں۔ اور جب گاندھی اروِن سمجھوتا ہو گیا اور کانگرس نے گول میز کانفرنس کی دعوت قبول کر لی تو یہ جماعتیں بھی میدان سے واپس لوٹ آئیں۔ ان جماعتوں کی حیثیت کانگرس کے نزدیک کس قدر بے حقیقت تھی اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ کانگرس نے جب حکومت سے معاملہ کیا تو ان عزیزوں سے مشورہ تک نہیں کیا اور نہ کانفرنس کی دعوت قبول کرتے وقت انہیں یاد رکھا۔
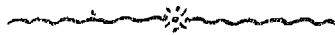
تیرہواں باب[۱۳]

سول نافرمانی اور گاندھی اردن سمجھوتا

نہرو رپورٹ کو دریائے راوی میں غرق کر چکنے کے بعد جب کانگرس نے "آزادی کامل" کا اعلان کر دیا تو گویا حکومت اور کانگرس کے درمیان ہر قسم کی آئینی گفت وشنید کا دروازہ بند ہوگیا اب کانگرس کے لئے ایک ہی صورت رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ حکومت کے خلاف جلد سے جلد کوئی موثر اقدام کرے۔ لاہور کانگرس کے اجلاس میں یہ طے ہو چکا تھا کہ کانگرس سول نافرمانی کرے گی اور سول نافرمانی کے پروگرام میں پہلا نمبر یہ تھا کہ کونسل اور اسمبلی کے ممبر مستعفی ہو جائیں۔ ۲ر جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگرس کی نئی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس میں پروگرام کے مطابق کونسلوں اور اسمبلی کے ممبروں سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔ ۱۷۲ ممبران اسمبلی و کونسل کانگرس کے فیصلہ کے مطابق مستعفی ہوتے ۲۶ر جنوری کو کانگرس نے یوم آزادی منایا۔ ۱۲ر مارچ ۱۹۳۰ء کو نمک بنا کر سول نافرمانی کرنے کی غرض سے گاندھی جی نے اپنے آشرم سے ڈانڈی کی طرف کوچ کیا۔ ۵ر اپریل کو ڈانڈی پہونچے ۶ر اپریل سے سول نافرمانی شروع کی اور ۴ر مئی ۱۹۳۰ء کو حکومت ہند کے حکم سے گرفتار کرکے یروودہ جیل میں

بند کر دئے گئے۔ اس سول نافرمانی کی اجازت کانگرس نے صرف گاندھی جی اور انکے رفقائے کار کو دی تھی اور گاندھی جی کو اس جد و جہد کا واحد رہنما تسلیم کیا تھا چنانچہ جب گاندھی جی نے سابرمتی سے ڈانڈی کی طرف کوچ کیا تو ان کے ساتھ صرف (۷۱) رضاکار تھے۔

گاندھی جی کی گرفتاری کے بعد سول نافرمانی جاری رہی۔ شراب اور بدیشی کپڑوں پر پکٹنگ، عدالتوں اور کچہریوں کا بائیکاٹ اور سرکاری محاصل کے دینے سے انکار ان ہی لائینوں پر سول نافرمانی کی گئی حکومت نے نہایت سختی سے اس کو دبانے کی کوشش کی ہزاروں سینہ گرہی جیل میں بھر دئے۔ لاکھوں روپیہ ان پر جرمانہ کیا اور سختی کر کے ان کی جائیدادوں سے وصول کرنا شروع کر دیا اسی سول نافرمانی کے دوران میں بنگال اور پنجاب میں پھر دہشت انگیزوں کی سرگرمیاں زور پکڑ گئیں قتل، ڈاکہ اور رہزنی کی وارداتیں عام ہو گئیں اور سارے ملک میں بےچینی پیدا ہو گئی۔ یہ حالت دیکھ کر ملک کے اعتدال پسندوں کو کانگرس اور حکومت کے درمیان صلح صفائی کرانے کا خیال آیا۔ سر تیج بہادر اور مسٹر جیکار اس کام کے لئے مستعد ہوئے وائسرائے اور گاندھی جی سے اس سلسلہ میں طویل گفتگو رہی اور بالآخر ان شرائط پر سمجھوتہ ہو گیا کہ کانگرس گول میز کانفرنس میں حصہ لے اور ہندوستانی نمائندوں کی اکثریت جس طرح حکومت کو اپنے لئے تجویز کرے اسی پر حکومت برطانیہ بھی اپنا مشورہ دیدے۔ سول نافرمانی کے قیدیوں کی رہائی کا حکم دیدیا گیا۔ منقولہ جائداد واپس کر دی گئی اور اس کے جواب میں کانگرس نے غیر مشروط طریقہ پر اپنی سول نافرمانی کی تحریک واپس لے لی۔ گاندھی جی جیل سے باہر آ گئے اور ۵ مارچ ۱۹۳۱ء کو لارڈ ارون وائسرائے ہند اور گاندھی جی کے مابین ایک معاہدے پر دستخط ہو گئے یہی معاہدہ "گاندھی ارون سمجھوتا"

کہلاتا ہے۔ اس معاہدے کے بعد ملک میں سول نافرمانی بند کر دی گئی اور کانگرس کے ذمہ دار ممبروں نے لندن میں گول میز کانفرنس کی مہم کے لئے تیاریاں شروع کر دیں۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ سول نافرمانی بند کرنے اور گول میز کانفرنس کی مہم کی تیاریوں میں ان مسلم جماعتوں سے کانگرس نے کوئی مشورہ نہیں کیا جو اس سول نافرمانی میں کانگرس کے ساتھ تھیں اور جنہوں نے اس سلسلہ میں کافی جانی اور مالی قربانیاں دی تھیں۔ گویا مسلمانوں کی قربانیاں ایک مرتبہ پھر رائیگاں گئیں!

چودھواں باب ۱۴

گول میز کانفرنس اور فرقہ وار مسئلہ

سائمن کمیشن نے ۱۹۳۰ء کے اوائل میں اپنی رپورٹ انگلستان کی مزدور حکومت کے آگے پیش کر دی اس رپورٹ میں ہندوستان کے رائج الوقت طرز حکومت کا ملک کے حالات کی روشنی میں تفصیل سے جائزہ لیا گیا تھا اور نظم ونسق کے ہر شعبہ کے متعلق کمیشن نے اپنی رائے پیش کی تھی۔ فوج، شعبہ دفاع اور تعلقات خارجہ کو بالکلیہ حکومت برطانیہ کے زیر نگرانی رکھ کر سائمن کمیشن نے حق رائے دہندگان میں توسیع اور جداگانہ طریقہ انتخاب کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا اس شرط کے ساتھ کہ جب تک ملک کی اقلیتوں کو اکثریت کی طرف سے پورا پورا اطمینان حاصل نہ ہو جائے اس وقت تک نیابت جداگانہ کو برقرار رکھنا ملک کے لئے مفید ثابت ہوگا اس کے علاوہ حکومت ہند اور ہوم گورنمنٹ کے تعلقات سول سروس، مالیات ہند اور برما کی علیحدگی کے متعلق بھی سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ دیسی ریاستوں کے مسئلہ کو اس رپورٹ میں نہیں چھیڑا گیا تھا اس لئے کہ اس مسئلہ کی تحقیقات کے لئے حکومت نے ایک اور کمیشن مقرر کیا تھا۔ آخر میں کمیشن نے ان لائینوں پہ ہندوستان کے لئے فیڈرل طرز حکومت

کی سفارش کی تھی۔

اس رپورٹ کی سفارشات پر غور کرنے کیلئے حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۰ء میں پہلی گول میز کانفرس طلب کی جس میں روسائے ملک مجالس قانونساز کے ممبر مسلمانوں کے اور دوسری اقلیتوں کے نمائندوں اور ہندوستان کی اعتدال پسند سیاسی جماعتوں کے ساتھ کانگرس کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی۔ کانگرس کے نمائندے جیسا کہ آپ پچھلے باب میں پڑھ چکے ہیں اس کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے لیکن ہندوستان کی دوسری جماعتوں اور روسا نے اس میں شرکت کی۔

پہلی گول میز کانفرنس ۱۹۳۰ء کے آخر میں منعقد ہوئی۔ انگلستان کی مزدور پارٹی کے بعض لیڈروں کے ماتحت رپورٹ کے اہم مسائل پر غور کرنے کے لئے علحدہ علحدہ چند کمیٹیاں بنادی گئیں اور گول میز کانفرنس کا کام شروع ہوگیا۔

والیان ریاست میں سے بعض نے متحدہ ہندوستان کے نصب العین کو اس شرط کے ساتھ تسلیم کر لیا کہ جو اعزازات و مراعات انہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ سے حاصل ہیں وہ بدستور برقرار رہیں اور ان میں مطلق کوئی کمی بیشی نہ کی جائے اسی کے ساتھ یہ اصول بھی بالاتفاق طے ہوگیا کہ شعبہ مدافعت اور محکمہ خارجہ کا تعلق براہ راست گورنر جنرل سے ہوگا اس کے بعد تحفظات پر طویل بحث ہوئی وفاق ہند کے ممبروں کے حقوق کی حفاظت، ہندوستان کے ذمہ قرضوں کی ادائی کی ضمانت، اور سول سروس کے حقوق کا تحفظ زیر غور آیا اور آخر میں اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کے مسئلہ پر بحث چھیڑی اور یہ اصول طے پایا کہ ان تحفظات کی تکمیل کے سلسلہ میں گورنر جنرل اور گورنر کو آخری حکم بنادیا جائے۔ لیکن یہ صرف اصول ہی اصول تھے اہم بنیادی امور ابھی طے نہیں ہوئے تھے انہیں دوسری گول میز کانفرنس کیلئے

اٹھا رکھا گیا تھا۔

دوسری گول میز کانفرنس کے وقت تک سول نافرمانی ملک میں بند ہو چکی تھی اور حکومت اور کانگرس کے درمیان ایک سمجھوتہ بھی ہو چکا تھا، اس لئے کانگرس کے لئے کانفرنس میں شرکت کا راستہ صاف تھا۔ چنانچہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگرس نے گاندھی جی کو اپنے واحد نمائندے کی حیثیت سے شرکت کرنے بھیجدیا۔

گاندھی جی نے دوسری گول میز کانفرنس میں چھوٹتے ہی یہ دعوے کیا کہ کانگرس ہی تمام ملک کی نمائندہ جماعت ہے اور حکومت پر زور دیا کہ وہ اس دعوے کو تسلیم کرلے۔ لیکن اقلیتوں کے نمائندوں نے اس دعوے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور گاندھی جی کو اسی پر قناعت کرنا پڑا کہ کانگرس بھی ہندوستان کی اور جماعتوں کی طرح ایک سیاسی جماعت ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے تحفظات کے متعلق کانگرس کا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس صرف انہی تحفظات کو قبول کرے گی جو صریحاً ملک کے مفاد کے لئے وضع کئے جائیں حکومت نے جو تحفظات تجویز کئے تھے ان کی گاندھی جی نے اس بنا پر مخالفت کی کہ اس سے حکومت اور ہندوستانیوں کے درمیان بے اعتمادی بڑھتی ہے لیکن ان سب سے زیادہ شدید اختلافی مسئلہ ہندوستان کی دوسری اقلیتوں کے تحفظ حقوق کا معاملہ تھا اور کانگرس اس بارے میں ملک کی نمائندگی کے بلند بانگ دعوے کے باوجود کوئی فارمولا مرتب نہ کرسکی تھی۔ گول میز کانفرنس کی بینا ... ٹی کمیٹی نے بھی اسے حل کرنے کی انتہائی کوشش کی مگر وہ بھی ناکام رہی اب توقع صرف کانگرس اور گاندھی جی کی ذات سے تھی کہ اگر وہ دل سے اس کی کوشش کریں اور ہندو مہاسبھا کے پیروؤں پر اپنا اثر ڈال سکیں تو اس کا حل ہوسکتا تھا۔ لیکن یہ توقع بھی پوری نہ ہوسکی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ٹالا کہ اپنے مطالبات کانگرسی مسلمانوں

یعنی اس مختصر سی جماعت کے مشورے سے مرتب کریں جو وفاداری کے ساتھ کانگرس کی حامی تھی اور مسلمانوں کی نمائندگی سے اُسے دُور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا اور مسلم اکثریت کا نقطہ نظر ایک نہیں ہو سکتا تھا لیکن جب مسلمانوں نے اس ناممکن کو بھی ممکن بنانے کی کوشش شروع کر دی تو گاندھی جی نے ایک اور اڑنگا لگا دیا۔ مسلمان متحد ہو کر سکھوں کو راضی کر لیں کہ وہ پنجاب میں مسلم تجاویز کی مخالفت نہ کریں۔ یہ کام اس سے بھی زیادہ ٹیڑھا تھا پنجاب میں سکھ اپنی تناسب آبادی سے بہت زیادہ سیاسی مراعات چاہتے تھے اور مسلمانوں کے لئے ان کا خوش کرنا بالکل ناممکن تھا۔

بہرحال اقلیتوں کے تحفظ حقوق کے مسئلہ میں دیسی عیسائیوں اور اچھوتوں کا نقطہ نظر مسلمانوں سے مختلف نہ تھا لیکن سکھ ہندوؤں کے ساتھ تھے اور ساری بحث جداگانہ انتخاب اور صوبوں میں تناسب آبادی پر پاسنگ دیے جانے کے متعلق تھی۔ مسلمانوں نے تو اپنی طرف سے اس موقع پر انتہائی رواداری سے کام لیا تھا اور سر آغا خاں نے مسلمانوں کی طرف سے گاندھی جی کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ اگر ہندو صرف مسلمانوں کے تحفظ حقوق کی ذمہ داری لیں تو مسلمان باقی سارے مطالبات میں کانگرس کے ساتھ ہیں۔ مسلمانوں کی اس آمادگی کو دیکھ کر سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سرینواس شاستری وغیرہ نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ اس مسئلہ کو پانچ آدمیوں کی ایک مخصوص کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے اور یہ کمیٹی جو بھی اس سلسلہ میں تجویز کرے اسے تسلیم کر لیا جائے۔ سر آغا خان نے فوراً اس کمیٹی کے فیصلہ کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن پنڈت مالویہ اور ڈاکٹر مونجے جو مہاسبھا کی طرف سے آئے تھے اس پر راضی نہ ہوئے۔

اس نوبت پر گاندھی جی نے اپنی طرف سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلمانوں کے چودہ نکات اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ تسلیم کر لیا جاتا ہے بشرطیکہ مسلمان کانگرس کے ساتھ ہو کر ملک کی دوسری اقلیتوں کے مطالبات کی مخالفت کریں گاندھی جی نے یہ چال محض اس لئے چلی تھی کہ اس موقع پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے درمیان مہاسبھائی ذہنیت کے مقابلہ میں جو سمجھوتہ ہو چکا ہے وہ ٹوٹ جائے اور کانگرس ان میں سے فرداً فرداً ہر اقلیت کے مطالبہ کو ٹھکرا کر رکھ دے لیکن مسلمانوں نے اس انتہائی ذلیل اور اہانت آمیز تجویز کو ماننے سے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ اس انکار کے ساتھ ہی سمجھوتے کے سارے قرائن ختم ہو گئے لیکن مہاسبھائی ہندو اور کانگرس کو اقلیتوں کے اس معاہدے سے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا اس لئے پنڈت مالویہ اور ڈاکٹر مونجے نے گاندھی جی کی تائید سے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان سے درخواست کی کہ فرقہ دار مسئلہ میں چونکہ ہندوستانی متحد نہیں ہو سکے اس لئے اس بارے میں وہ اپنا فیصلہ صادر کر دیں اور اس فیصلہ کو اگر ساری سیاسی جماعتیں اور اقلیتیں تسلیم کر لیں گی تو کانگرس بھی اس کو مان لے گی۔ یہ درخواست وزیر اعظم کی خدمت میں بھیجی گئی جس پر ہندوؤں سکھوں اور کانگرسی ہندوؤں کے دستخط تھے لیکن مسلمانوں نے اس درخواست پر دستخط نہیں کئے اور فیصلہ کی منظوری یا نامنظوری کے اعلان کا اپنا لئے حق باقی رکھا۔ ہندوؤں کی طرف سے وزیر اعظم کی خدمت میں اس درخواست کے پیش کرنے کے واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصدق احمد خاں شیروانی مرحوم جو نشنلسٹ پارٹی کے سکرٹری تھے فرماتے ہیں :-

"مسٹر محمد شفیع نے مسلمانوں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی تھی

کہ معین نشستوں کے ساتھ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے مگر پنڈت مدن موہن مالویہ نے اسے محض "ایک" نشست کی کمی بیشی کی بنا پر نامنظور کر دیا اور چونکہ ہندوؤں کو "بیداری ہند" کے مصنف مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم انگلستان سے توقعات تھیں اس لئے ان کے نام چٹھی لکھی گئی کہ وہ فرقہ وارانہ فیصلہ دیں اس چٹھی پر کسی مسلمان نے دستخط نہیں کئے اور ہندوؤں میں گاندھی جی مسز نائیڈو اور سر تیج بہادر سپرو نے بھی دستخط نہیں کئے تھے"۔ (سیاست وطنی صہ ۱۲۴)

دوسری گول میز کانفرنس میں یہ تو کانگرس اور ہندوؤں کا رویہ تھا جو ملک کو آزاد کرانے کے مدعی تھے اور یہ مسلمانوں کا رویہ تھا کہ صرف اپنے سیاسی حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری وہ چاہتے تھے اور کانگرس کے ہر مطالبہ میں کانگرس کی حمایت کرنے کو تیار تھے۔ اس موقع پر ہمیں مولانا محمد علی کا وہ معرکہ آرا بیان یاد آگیا جو اسی (دوسری گول میز کانفرنس کے) اجلاس میں انہوں نے دیا تھا۔ یہ وہ مولانا محمد علی ہیں جنہیں کانگرس کی طرف سے رجعت پسند اور فرقہ پرست کا خطاب مل چکا تھا اور جن کے متعلق ہندوؤں نے گویا طے کر لیا تھا کہ انہیں اپنے ملک کی آزادی سے کوئی دلچسپی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی محمد علی اس اجلاس میں آخری مرتبہ تقریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"میں اس بات کی پروا نہیں کرتا کہ آپ ہمارے لئے کون سا دستور اساسی تیار کرتے ہیں۔ لیکن کاش آپ کے پاس انگلستان میں ایک آدمی بھی ہو، جو در حقیقت انسان ہو۔ اور جس کے

متعلق شاعر نے کہا ہے" اے خدا ایسا انسان دے جو دل ودماغ اور ہاتھ رکھتا ہو وہ اُن بڑے آدمیوں کی طرح ہو جو ہمیشہ کے لئے گذر چکے ہیں ایک شور دغوغا سے لبریز سرزمین میں ایک طاقتور آدمی کی ضرورت ہے وہ خواہ امیر ہو خود مختار ہو، جمہوریت پسند ہو، کچھ بھی ہو۔ مگر ایسا ہونا چاہئے جو حکومت کرسکے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کرے" مجھے امید ہے کہ میرے قدیم دوست مسٹر میکڈ انلڈ کم سے کم اپنے آپکو ایسا حکمراں آدمی ثابت کر دکھائیں گے اور وہ اپنی جماعت، اپنے ضمیر، اپنی مردہ بیوی کی روح اور اپنے زندہ ملک سے جھوٹ بولنے کی جرأت نہ کریں گے۔

——— آج جس ایک مقصد کے لئے میں یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو اسی حالت میں واپس جاؤں جبکہ آزادی کا پروانہ میرے ہاتھ میں ہو۔ میں ایک غلام ملک کو واپس نہیں جاؤں گا میں ایک غیر ملک میں جب تک وہ آزاد ہے مرنے کو ترجیح دوں گا۔ اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر آپ کو یہاں مجھے قبر کے لئے جگہ دینی پڑے گی مجھے امید ہے کہ ہم یہ تمام چیزیں لے کر واپس جائیں گے۔ اگر ہمیں یہ چیزیں نہ ملیں تو ہم ملک کی لڑائی لڑنے والوں کی صفوں میں وہیں چلے جائیں گے جہاں ہم دس سال پہلے موجود تھے وہ آج ہمیں ملک کا غدار کہتے ہیں اسوقت آپ ہمیں باغی کہہ لیجئے گا ———

——— میں آپ سے درجہ نو آبادیات لینے کے لئے نہیں آیا ہوں میں ڈومینین اسٹیٹس کا قائل نہیں ہوں میں کامل آزادی کے عقیدہ کا

پابند ہوں۔"

کانگریس کے بنائے ہوئے "غدار ملک" محمد علی کی اس تقریر پر غور کیجئے اور سوچئے کہ ملک کو آزاد کرانے کی سچی تڑپ کس میں ہو سکتی ہے ہندوؤں میں یا مسلمانوں میں؟۔ ان میں جو آزادی کا مفہوم اپنا قومی اقتدار سمجھتے ہیں یا ان میں جو صحیح معنوں میں ملک کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں؟۔ ان میں جو اپنی ادھی ادھی پر اڑ جانے کو تیار تھے یا ان میں جو اپنے "وجود" کے سوا باقی سب کچھ وطن پر نثار کرنے کو تیار رہیں؟

جب ایسے شیدایان حریت اور فدایان وطن کو جو سرے سے مول تول ہی نہیں جانتے تھے ہندو مطمئن نہ کر سکے تو آئینی مول تول کرنے والے مسلمانوں سے ہندوؤں کا سودا کیونکر بن سکتا ہے؟

پندرھواں باب
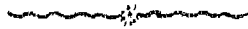
مخلوط اور جداگانہ انتخاب کے معرکے

اُدھر لندن میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے اِدھر ہندوستان کی مسلم اور غیر مسلم سیاسی جماعتوں میں طرزِ حکومت کے سوال پر بحث جاری تھی۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ نزاعی مسئلہ انتخاب کا تھا، ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے تو برابر مخلوط انتخاب پر زور دیا ہی جا رہا تھا کچھ مسلم جماعتیں بھی اس معاملہ میں ان کی ہمنوا تھیں خصوصاً نشنلسٹ حضرات نہایت سرگرمی کے ساتھ مخلوط انتخاب کے حامی تھے۔ اس طریقہ انتخاب کو قبول کر لینے کے متعلق سب سے بڑی دلیل ان کے پاس یہ تھی کہ اس سے آئندہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات درست ہو جائیں گے اور مستقبل کے ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کی تعمیر میں بہت مدد ملے گی۔

ان کے نزدیک ہندوستان کی آئینی ترقی کے لئے "متحدہ قومیت" کی تعمیر ضروری تھی اس لئے وہ ان افتراقی اصولوں کے خلاف تھے جن کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی معاملات پر کبھی اتحاد نہ ہو سکے۔

لیکن مسلمان من حیث القوم جداگانہ طریقہ انتخاب کے حق میں تھے۔ وہ

نہیں چاہتے تھے کہ مخلوط انتخاب کے ذریعہ مستقبل کے ہندوستان میں اپنی انفرادیت کو اکثریت میں گم کردیں، ان کے نزدیک مخلوط انتخاب کے ذریعہ کسی طرح حکومت میں ان کی قومی نمائندگی ممکن ہی نہ تھی، اس لئے کہ ہندوستان میں سوائے چند صوبوں کے مسلمان ہر جگہ اقلیت میں تھے اور ان صوبوں میں بھی جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی معاشی حیثیت سے مسلمان ہندو اقلیت کے زیر اثر تھے ایسی حالت میں اگر مخلوط انتخاب کو قبول کر لیا جاتا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ بلا کسی استثنا کے ہر صوبہ میں مسلمان ہندوؤں کے رحم وکرم پر ہو جائیں ان صوبوں میں بھی جن میں ان کی اقلیت ہے اور ان صوبوں میں بھی جن میں ان کی اتفاق سے اکثریت ہے۔ ظاہر ہے کہ مخلوط انتخاب کی یہ آئینی صورت مستقبل میں مسلمانوں کے قومی اور سیاسی وجود دونوں کے لئے مضر ثابت ہوتی۔

رہا متحدہ قومیت کی تعمیر کا سوال، جداگانہ طرز انتخاب کے حامیوں کی رائے میں یہ اسوقت تک حل نہیں ہو سکتا تھا جب تک ہندو اپنی جداگانہ قومیت کے تخیل سے دست بردار نہ ہو جائیں اور ہندوستان میں ایک مشترک کلچر کی بنیاد ڈالنے کی دل سے کوشش نہ کریں۔ کیونکہ جن اصولوں پر ہندو متحدہ قومیت کی تعمیر کرنی چاہتے تھے وہ ان کے اپنے مخصوص مذہبی اور قومی اصول تھے اور ان کو تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو "متحدہ قومیت" کی خاطر بلا کسی شرط کے ہندو قومیت میں ضم کر دیں۔ اس اعتبار سے "متحدہ قومیت" کا تخیل چاہے کتنا ہی خوشنما اور اپنے اندر کتنی ہی جذب وکشش کیوں نہ رکھتا ہو، مسلمانوں کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا تھا۔
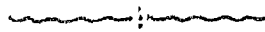
جداگانہ طرز انتخاب کے مسئلہ کو سب سے زیادہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس نے

ہوادی جو ۱۹۰۶ء میں سر آغا خاں کی صدارت میں قائم ہوئی تھی۔ مسلم لیگ اسوقت بے جان جماعت تھی، خلافت کمیٹی برائے نام قائم تھی لیکن جداگانہ انتخاب کے معاملہ میں دونوں جماعتیں مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے ساتھ تھیں۔ اور مسلم کانفرنس نے اس سلسلہ میں ہر شہر میں مظاہروں کا انتظام کیا جگہ جگہ اپنے جلسے کئے اور مسلم رائے عامہ کی صرف اسی ایک نقطہ پر ترتیب کو اپنا مقصد اعلیٰ قرار دے لیا۔

نشلسٹ، احرار جمعیۃ العلماء اور خدائی خدمتگار مسلم کانفرنس کے خلاف تھے جس کے باعث جداگانہ انتخاب کے مظاہروں میں کہیں کہیں روک بھی پیدا ہوئی۔ اور آپس میں تصادم بھی ہوا لیکن مسلمان اکثریت جداگانہ طرز انتخاب ہی کے حق میں رہی۔

اکثر مسلم جماعتوں کی طرف سے مسلم کانفرنس کی مخالفت محض اس بنا پر ہوتی تھی کہ یہ جماعت جن افراد پر مشتمل تھی ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے کبھی ملک کے لئے قربانیاں نہیں دی تھیں، یہ لوگ اسمبلی یا کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر تھے یا وہ لوگ تھے جنہیں حکومت کی طرف سے خطابات اور اعزازات حاصل تھے۔ بدگمانی یہ تھی کہ یہ لوگ جہاں حکومت کا قدم بیچ میں آجائیگا مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت نہ کر سکیں گے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ بدگمانی بے وجہ نہیں تھی فی الحقیقت اس جماعت پر جو ایک وقتی ضرورت کے لئے بنالی گئی تھی چند ایسے غرض پرست افراد نے قبضہ کر لیا تھا جو اس کے ذریعہ حکومت میں اپنی نمود اور آئندہ دستور میں ذاتی ترقیوں کے لئے اپنا راستہ صاف کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اسوقت چونکہ انہوں نے ایک ایسے مطالبہ کی حمایت کی تھی جسے اکثر مسلم جماعتوں کی تائید حاصل تھی اور جس میں عام مسلمان کے لئے جذب و کشش کا پورا پورا سامان موجود تھا اس لئے اس جماعت کو نہیں بلکہ اس مطالبہ کو سارے

ملک میں بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور یہ استثنار چند ہندوستان کے سارے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ جداگانہ طرز انتخاب قرار پاگیا۔

سولھواں باب

فرقہ وار فیصلہ اور میثاق پونہ

دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائی بھی ختم ہوئی، ہندوستان کے دستور جدید کا خاکہ تقریباً مکمل ہو گیا اس کا اہم جزو جو فرقہ وار نیابتوں کے متعلق تھا اسکا اختیار بھی ہندوؤں نے وزیر اعظم کو دیدیا اس اعتراف کے ساتھ کہ ہندوستانی خود آپس میں اپنے متعلق کسی فیصلہ پر پہونچنے کے ناقابل ہیں۔ حکومت برطانیہ کو بالکلیہ ہندوستانی اقوام کی قسمتوں کا مالک بنا کر گاندھی جی کانگرس کے واحد نمائندہ جب ہندوستان واپس پہونچے تو یہاں انہوں نے عجیب کیفیت دیکھی ان کی آمد سے پانچ چار روز پہلے کانگرس کے کئی مشہور لیڈر گرفتار ہو کر جیلوں میں بند کر دئے گئے تھے اور ملک میں آرڈیننسوں کا زور تھا۔

ملک میں یہ صورت حال دراصل شروع ۱۹۳۱ء ہی سے قائم تھی پنجاب کے تین انقلاب پسند نوجوان بھگت سنگھ وغیرہ کو جب حکومت نے مارچ ۱۹۳۱ء میں سازش اور بغاوت کے جرم میں پھانسی دی تو عام ہندوؤں کے ساتھ کانگرس نے بھی جو عدم تشدد کے عقیدے کی دعویدار تھی ان کا زبردست سوگ منایا جلسے کئے جلوس نکالے ہڑتالیں کیں ان ہڑتالوں اور مظاہروں میں مسلمان شریک نہیں

ہوتے۔ ہندؤں نے جبراً مسلمانوں سے بھی ہڑتالیں کرانی چاہیں نتیجہ یہ ہوا کہ جگہ جگہ ہندو مسلم فساد ہوئے قتل اور لوٹ کا بازار گرم ہوا اور جان اور مال کی شدت سے بربادی ہوئی ان مقامات میں سب سے زیادہ تباہی کانپور، آگرہ بنارس اور مرزا پور میں آئی ہندو مسلمانوں کے خاندان کے خاندان اس دیوانگی کے نذر ہو گئے محلے کے محلے جلا کر خاک سیاہ کر دیئے گئے غرض لوٹ اور غارت گری کے سلسلہ میں کوئی کسر ان مقامات پر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ ظاہر ہے ان واقعات کے بعد ہندؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کیوں کر صحیح رہ سکتے تھے۔ کچھ کشیدگی پہلے ہی سے تھی تازہ واقعات نے اس کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور پھر ایک طرف تو یہ ہندو مسلم فساد ہو رہے تھے دوسری طرف کانگرس کی طرف سے بدیشی کپڑوں پر پکٹنگ اور بعض صوبوں میں عدم ادائے گی لگان کی تحریک جاری تھی، جس سے ملک میں اور زیادہ بےچینی پیدا ہو گئی تھی، ان مختلف قسم کی تحریکوں کو جو برابر ہندوستان کے امن میں خلل ڈال رہی تھیں دور کرنے کیلئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے پے در پے آرڈنینس جاری کرنے شروع کر دیئے ان آرڈنینسوں نے سب سے زیادہ بنگال کے دہشت انگیزوں کو مشتعل کیا اور وہاں کئی انگریز حاکموں کو انہوں نے قتل کر ڈالا، اس پر حکومت نے اور زیادہ سختی برتی ہندوستانیوں کی سول آزادی پر بھی بندشیں عاید کر دیں اس کے خلاف ملک میں اور شور برپا ہوا۔ اسی دوران میں خان عبدالغفار خان نے صوبہ سرحد میں اپنے خدائی خدمتگاروں کی مدد سے حکومت کے خلاف عدم ادائیگی ٹیکس کی تحریک شروع کر دی، پنڈت جواہر لال نے یوپی میں کسانوں کو لگان ادا کرنے سے منع کر دیا۔ غرض ۱۹۳۱ء کا پورا برس ایسے ہی ہنگاموں سے پُر تھا جن کو فرو کرنے کے لئے حکومت ہند نے آرڈنینس پر آرڈنینس جاری کرنے شروع کر دیئے اور چن چن کر کانگرس کے ان سب لیڈروں کو گرفتار کر لیا جو حکومت کے نزدیک اس

بے چینی کے باعث ہو رہے تھے۔

جس وقت گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس سے ہندوستان واپس ہوئے ہیں اس وقت ہندوستان کی عام حالت یہ تھی۔ پنڈت جواہرلال، تصدق احمد خاں شیروانی پرشوتم داس ٹنڈن خان عبدالغفار خاں وغیرہ جیل میں تھے اور جو کانگریسی لیڈر جیل سے باہر تھے وہ گاندھی جی کی آمد اور ان کے فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے آتے ہی وائسرائے سے خط وکتابت کے ذریعہ ملک کی اس صورت حال کو درست کرانا چاہا اور اس سلسلہ میں یہ مطالبہ کیا کہ جس قدر آرڈیننس حکومت نے جاری کر رکھے ہیں وہ سب واپس لے لئے جائیں لیکن وائسرائے نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کیا اس پہ کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور اس نے "گاندھی ارون" معاہدے کو کالعدم قرار دیکر دوبارہ سول نافرمانی شروع کرنے کا فیصلہ کر دیا اس فیصلہ کے اعلان کے ساتھ ہی حکومت ہند نے ۴ر جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی اور ان کے ساتھ ولبھ بھائی پٹیل کو گرفتار کر کے یرودہ جیل میں نظر بند کر دیا۔ چنانچہ گاندھی جی یرودہ جیل میں نظر بند ہی تھے کہ وزیراعظم نے فرقہ وار نیابت اور حقوق کے مسئلہ میں اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

وزیراعظم کے فیصلہ صادر کرنے سے پہلے گاندھی جی نے یرودہ جیل سے سر سیموئل ہور وزیر ہند کو لکھا تھا کہ اس فیصلہ میں کم سے کم اچھوتوں کے لئے جداگانہ نیابت کا اصول نہ تسلیم کریں اسی کے ساتھ یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا اور اچھوتوں کو ہندؤں سے جدا کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ (یعنی گاندھی جی) برت رکھ کر اپنی جان دیدینگے۔ لیکن گاندھی جی کے اس خط کا حکومت برطانیہ پہ

کوئی اثر نہیں ہوا اور اگست ۱۹۳۲ء میں وزیر اعظم کا فرقہ وار فیصلہ شائع ہو گیا اس فیصلہ میں ہندوستان کی ساری اقلیتوں کے لئے جداگانہ نیابت کا اصول تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور پست اقوام کے لئے خاص طور پر علحدہ نشستیں جداگانہ انتخاب کے اصول کے مطابق مقرر کی گئی تھیں لیکن اس اعلان کے ساتھ وزیر اعظم نے اس امر کی صراحت بھی کر دی تھی کہ اگر ہندوستان کی مختلف اقوام آپس میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو حکومت اس سمجھوتے کے مطابق اس فیصلہ میں ترمیم کر دے گی اس فیصلہ کے شائع ہوتے ہی ہندوؤں میں سخت برہمی پیدا ہو گئی اس لئے کہ اچھوتوں کے وجود کو ہندوؤں سے علحدہ تسلیم کر لینے کے معنی یہ تھے کہ ہندوستان میں ہندو قوم اقلیت میں آجائے اور اس کی ساری سیاسی اہمیت رخصت ہو جائے۔ ہندو ہرگز اس کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، گاندھی جی نے جیل ہی میں سے اعلان کیا کہ وہ اس فیصلہ کے خلاف "مرن برت" رکھیں گے۔ چنانچہ یہ مرن برت شروع ہوا۔ اور چوتھے پانچویں دن سر تیج بہادر اور دوسرے اعتدال پسندوں کے بیچ بچاؤ سے اچھوتوں کے نمائندوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں میں ایک معاہدہ ہو گیا جس میں اچھوتوں نے اپنے جداگانہ حق انتخاب سے دست برداری کر لی اور اونچی ذات کے ہندوؤں نے انہیں ہر صوبے میں نشستیں دینے کا اقرار کر لیا۔ اس معاہدے کو "میثاق پونہ" کہا جاتا ہے۔

"میثاق پونہ" کے بعد فرقہ وار فیصلہ میں اسی قدر ترمیم حکومت نے منظور کر لی اور باقی فیصلہ بحال رکھا۔

پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ مسلمانوں نے اپنی طرف سے نہ اس ثالثی فیصلہ کی وزیر اعظم سے اپیل کی تھی اور نہ اس درخواست پر دستخط کئے تھے جس کے

ذریعہ ہندوؤں نے یہ کام وزیراعظم کے سپرد کیا تھا بلکہ اس کے برخلاف مسلمانوں نے اس سے اختلاف کا حق اپنے لئے محفوظ رکھا تھا۔ چنانچہ جس وقت وزیراعظم کا فرقہ وار فیصلہ شائع ہوا تو اگرچہ مسلمان اس سے مطمئن نہیں ہوئے اس لئے کہ ان کے بہت سے مطالبات اب بھی پورے نہیں ہوئے تھے پنجاب اور بنگال میں ان کی اکثریت مشتبہ ہو گئی تھی، تمدن اور معاشرت کی اصلاح کے سلسلہ میں مجالس قانون ساز پر حکومت نے وہ پابندیاں منظور نہیں کی تھیں جس کا مطالبہ مسلمانوں نے کیا تھا اسی کے ساتھ ملازمتوں اور وزارتوں کا سوال بھی ادھورا رہ گیا تھا لیکن ان سب خامیوں کے باوجود مسلمان خاموش رہے اس لئے کہ اس فیصلہ کی مخالفت کرنے کے معنی ہی یہ تھے کہ اپنی کمزوریوں کی تشہیر کی جائے اگر ہندو اور مسلمان خود آپس میں اپنے حقوق طے کر لیتے تو وزیراعظم کے اس فیصلہ کی ضرورت ہی کیوں ہوتی لیکن جب آپس ہی میں اتفاق نہ ہو سکا تو اس فیصلہ کو کیا الزام دیا جائے جو ہماری نااتفاقی کے باعث ہمارے سر تھوپا گیا ہے۔ برخلاف اس کے ہندو سبھائیوں نے جنہوں نے خود اپنی ناقابلیت کے اعتراف کے ساتھ وزیراعظم سے یہ درخواست کی تھی کہ ہندوستانیوں کے مختلف فرقوں کے درمیان فیصلہ کر دیں، اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور باوجود اس ترمیم کے بھی جو ہندوؤں اور اچھوتوں کے آئندہ تعلقات کے متعلق اس فیصلہ میں "میثاق پونہ" کے مطابق قبول کر لی گئی تھی ہندو سبھائیوں کو اس کے تسلیم کرنے سے انکار رہا۔ اور برابر کانگرس اور ہندو مہاسبھا کے پلیٹ فارموں سے اس فیصلہ کی مخالفت جاری رہی۔

سترھواں باب
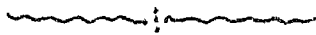
دستورِ جدید اور ہندوستان کی سیاسی جماعتیں

دسمبر ۱۹۳۲ء میں گول میز کانفرنس کا تیسرا اجلاس لندن میں ہوا، اس اجلاس میں کانگریس کے نمائندے اور اکثر مسلم لیڈروں نے شرکت نہیں کی۔ مسلم لیڈروں میں مسٹر محمد علی جناح قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے گول میز کانفرنس کے دوسرے ہی اجلاس میں دستورِ جدید کا جو خاکہ تیار ہو رہا تھا اس پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا تھا اور "فیڈریشن" کی اس خاص صورت کو جسے حکومتِ برطانیہ کے نمائندوں نے طے کر لیا تھا ہندوستان کے لئے سخت مضرت رساں قرار دیتے ہوئے اُسے "سفید ہاتھی" سے تشبیہ دی تھی جو خواہ مخواہ ہندوستانیوں کے سر منڈھا جا رہا تھا۔ اسی طرح چند اعتدال پسند لیڈر بھی تھے جنہیں دستورِ جدید سے مایوسی ہوئی تھی اور جو اس معاملہ میں مسٹر جناح کے ہم خیال تھے۔

بہرحال ان مخالفین دستورِ جدید کی اظہارِ بے اطمینانی کے باوجود گول میز کانفرنس نے اپنا کام ختم کر لیا اور مارچ ۱۹۳۳ء میں تینوں اجلاسوں کی رُوداد کو ایک جگہ ترتیب دیکر "وائٹ پیپر" کے نام سے شائع کر دیا۔

"وائٹ پیپر" کی اشاعت کے بعد ایک "سلیکٹ پارلیمنٹری کمیٹی" بنائی گئی

تاکہ گول میز کانفرنس کی روئداد کی روشنی میں ہندوستان کے لئے ایک مناسب دستور مرتب کرکے منظوری کے لئے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کردے۔
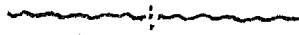
دستور جدید جب لندن میں آخری مرحلہ طے کر رہا تھا، ہندوستان کی سیاسی جماعتیں مختلف صورتوں سے اس کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ کانگرس نے تو یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ملک میں اس کے نفاذ کو بے اثر بنا دے گی۔ لبرل پارٹی نے یہ طے کیا تھا کہ گو یہ دستور ملک کی توقعات کو پورا نہیں کرتا پھر بھی اسے قبول کرکے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کی جائیگی۔ یہی رائے مسلم کانفرنس مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کی بھی تھی۔ اور جمعیتہ العلماء نے بھی بعد کو یہی رائے قبول کرلی تھی لیکن اسوقت مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی دونوں جماعتیں بے جان سی ہورہی تھیں بلکہ خلافت کمیٹی تو قریب قریب ختم ہو چکی تھی، اور مسلم لیگ پہ نہایت ہی گرے ہوئے قسم کے رجعت پسندوں کا قبضہ تھا اس لئے یہ دونوں جماعتیں مسلمانوں میں محض بے اثر ہو کر رہ گئی تھیں۔ نئی جماعت جو وقتی ضرورت کے لئے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے نام سے ۱۹۲۸ء میں قائم ہوئی تھی وہ البتہ باقی بھی تھی اور اس سلسلہ میں کچھ سرگرمی بھی دکھا رہی تھی لیکن خرابی یہ تھی کہ یہ جماعت بھی چند بے اصول سرکار پرستوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنی ہوئی تھی جس سے یہ لوگ اپنی ذات کے لئے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اور عام مسلمانوں میں اس جماعت کو بھی اعتماد حاصل نہ تھا۔

غرض مسلم سیاست میں سخت انتشار رونما تھا اور کوئی مسلم جماعت ایسی نظر نہ آتی تھی جو بابہ بیداصلاحات کے سلسلہ میں موثر طریقہ پر مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے۔ اس مایوسی کے عالم میں مسلمانوں کے چند ذمہ دار افراد کو مسلم لیگ

کے احیاء کا خیال آیا، اور لیگ کی رہنمائی کے لئے انہوں نے مسٹر محمد علی جناح کو چھانٹا۔ مسٹر محمد علی جناح اسوقت لندن میں تھے انہیں تار دیکر ہندوستان بلایا گیا ۴ مارچ ۱۹۳۴ء کو حافظ ہدایت اللہ کی زیر صدارت لیگ کا اجلاس کیا اور مسٹر محمد علی جناح کو مسلم لیگ کا مستقل صدر منتخب کر لیا۔

مسٹر محمد علی جناح کے مستقل صدر منتخب ہوتے ہی مسلم لیگ میں گویا جان سی آگئی اور وہ جماعت جو ایک مدت سے عملی سیاست میں بے اثر رہی تھی پھر تازہ دم ہو کر سیاست کے میدان میں اتر آئی۔ مسٹر محمد علی جناح نے لیگ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہی ایسے عنصر کو لیگ سے خارج کر دیا جن کا وجود لیگ کے لئے مضر ثابت ہو رہا تھا اور لیگ کے دستور اساسی میں ضروری ترمیم کے لئے ایک کمیٹی بنا ڈالی۔

اسی سال مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور مسٹر محمد علی جناح کو مسلمانان بمبئی نے بمبئی کے شہری حلقے سے بلا مقابلہ منتخب کیا، اسمبلی میں پہونچکر محمد علی جناح نے اپنا ایک انڈیپنڈنٹ بلاک بنایا اور محض اپنی سیاسی صلاحیتوں سے اس بلاک کو اس قدر با اثر بنا دیا کہ اسمبلی کی میزان اس کے ہاتھ میں آگئی۔

اس سال اسمبلی کے انتخاب میں "نشلسٹ" کے نام سے ایک جدید سیاسی پارٹی نے بھی پنڈت مالویہ کی قیادت میں کچھ نشستیں حاصل کر لی تھیں جو جناح پارٹی کی مقابل سمجھی جاتی تھی نشلسٹ پارٹی دراصل کانگرس پارٹی ہی کی ایک شاخ تھی، اور سوائے کمیونل اوارڈ کے باقی سارے سیاسی مسائل میں کانگرس کی ہم آواز تھی بلکہ اس پارٹی کو نشلسٹ پارٹی کے نام سے اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے کی ضرورت ہی اس لئے پیش آئی تھی کہ وہ فرقہ وار فیصلہ کے مسئلہ میں کانگرس کے نقطہ نظر سے متفق نہیں تھی اور علانیہ اس کی مخالفت کر کے اسے مسترد کرانا چاہتی تھی۔

۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو گول میز کانفرنس کی سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ اسمبلی میں پیش ہوئی کانگرس پارٹی نے اسے مسترد کرنے کی تجویز پیش کر دی اور فرقہ وار فیصلہ پر اپنا انداز غیر جانب وارانہ رکھا لیکن نشنلسٹ پارٹی کی طرف سے فرقہ وار فیصلہ کی شدید مذمت ہوئی اور اسے مسترد کر دینے کی تجویز پیش کی گئی۔ مسٹر محمد علی جناح نے اس کے جواب میں ترمیم پیش کرتے ہوئے نہایت زبردست تقریر کی جس میں یہ ثابت کیا کہ فرقہ وار فیصلہ کو اس وقت تک برقرار رکھنا بہت ضروری ہے جب تک ہم خود آپس میں کوئی فیصلہ نہ کر لیں انہوں نے کہا :۔

"میری ترمیم ہے کہ جب تک ہم آپس میں ملکر کوئی معقول اور اعلیٰ لائحہ عمل پیش نہ کر سکیں اس وقت تک فرقہ وارانہ حل تسلیم کر لینا چاہیئے، میرے ہندو دوست فرقہ وارانہ حل سے مطمئن نہیں ہیں بےشک میں خود بھی نہیں ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان بھی اس سے مطمئن نہیں ہیں، ہرگز نہیں کیونکہ یہ حل مسلمانوں کے درد کا پورا علاج نہیں ہے اور نہ اس میں ان کے مطالبات کا پوری طرح لحاظ رکھا گیا ہے۔" ——— "میرے معزز دوست اپوزیشن پارٹی کے لیڈر نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ پہلے ہمیں آپس میں ملکر حقوق حاصل کر لینے چاہئیں اس کے بعد تقسیم کا معاملہ ہوتا رہیگا" ——— "میں نہایت ادب کے ساتھ اس اصول کو منطقی اور بنیادی طور پر غلط سمجھتا ہوں اصل میں اقلیتوں کے مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ پہلے حقوق طلبی اور حصول حقوق پر عمل کیا جائے اور تقسیم کو مستقبل کے لئے ملتوی کر دیا جائے" ——— "یہ کوئی جاگیر نہیں ہے کہ پہلے حاصل

کی جائے گی اور بعد میں اس کی حصہ بنی ہوگی نہ یہ کوئی لوٹ کا مال ہے کہ بعد میں برابر کے حصے بانٹے جائیں۔ اگر یہ بات ہے تو گاندھی جی نے اچھوتوں کے معاملہ میں مرن برت کیوں شروع کیا تھا اور حصول حقوق سے پہلے تعین حقوق کے مسئلہ کو کیوں فوقیت دی تھی"۔

"حضرات صحیح طریقہ یہی ہے جو گاندھی جی نے اختیار کیا' اور میں بھی اسی پر زور دینا چاہتا ہوں بیشک گاندھی جی نے ٹھیک کیا انہیں معلوم تھا کہ اچھوت اور پسماندہ اقوام ہندوؤں کا پچاس فیصدی حصہ ہیں اور ان کو راضی کئے بغیر سیاسی اقتدار ہندو قوم سے علحدہ کرنا نہ چاہا۔ اور کسی نہ کسی طرح ان سے معاہدہ کر ہی لیا۔ میں نے انگلستان میں اُن سے کہا تھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں تو گاندھی جی نے جواب دیا کہ میں اچھوتوں کو ہندو قوم سے علحدہ حقوق دلوانا نہیں چاہتا ورنہ وہ عام ہندوؤں سے الگ ہو جائیں گے اور ہندو قوم انتشار اور سیاسی افتراق کا شکار ہو جائیگی لہذا میں پہلے ان ہی سے فیصلہ کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ گروہ ہندو جتھے سے باہر نہ نکلنے پائے چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔

میں ہندو دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں کہ انہوں نے اچھوتوں کو اپنے حقوق میں شریک بنا کر ان کو اپنا سیاسی حلیف بنا لیا میں اسی اسپرٹ کو اپنے لیے بھی دیکھنا چاہتا ہوں پس آئیے اور ہمارے ساتھ بھی اسی طرح کا انصاف کیجیے، میرا ہاتھ دوستی کے لیے بڑھا ہوا ہے آئیے اور یہی اسپرٹ دکھائیے۔ دوسروں سے لڑنے کے بجائے ہم خود کیوں نہ کسی معاہدے پر متفق ہو جائیں"؟ (سیاست دہلی ص۱۳۵)

مسٹر محمد علی جناح کی اس تقریر کے بعد کانگرس اور نیشلسٹ پارٹی دونوں کی تجویزیں گر گئیں، اور فرقہ وار فیصلہ بحال رہا۔ اسمبلی میں جناح پارٹی کا یہ تو اختلافی انداز تھا لیکن جب ملک کے سود و بہبود کی کوئی تجویز اسمبلی میں پیش ہوتی تو جناح پارٹی ہمیشہ کانگرس کا ساتھ دیتی، چنانچہ متعدد مرتبہ یہ ہوا کہ جناح پارٹی اور کانگرس پارٹی نے ملکر اسمبلی میں پے در پے حکومت کو شکستیں دیں۔

غرض جدید دستور کے نفاذ سے پہلے اسمبلی کے اندر ہندوستان کی جسقدر سیاسی جماعتیں کام کر رہی تھیں اور ملکی مسائل پر اپنے جماعتی عقائد اور اصول کی رہنمائی میں جس انداز سے روشنی ڈال رہی تھیں ان سے رائے عامہ کی ترتیب میں فی الحقیقت بڑی مدد ملی۔ اور ملک میں دستور جدید کے نفاذ کے لئے زمین ہموار ہونی شروع ہو گئی۔
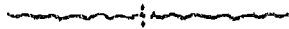
اٹھارہواں باب

فرقہ وار فیصلہ، جداگانہ انتخاب، اور اردو زبان کے خلاف منظم جدوجہد

اسمبلی کے اندر ملک کی سیاسی جماعتوں کا وہ انداز تھا لیکن اسمبلی کے باہر کی فضا کچھ اور وضع کی تھی۔ ہندو مسلم کشیدگی نہ صرف یہ کہ بدستور باقی تھی، بلکہ اب اس نے اور بھی زیادہ ناگوار صورت اختیار کر لی تھی۔ کانگرس نشلسٹ پارٹی اور ہندو مہاسبھا کی مشترکہ سعی پیہم سے فرقہ وار فیصلہ، جداگانہ انتخاب اور اردو زبان کے خلاف ہندوستان کی ہندو اکثریت میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا کئے جا رہے تھے اور جلسوں اور جلوسوں کے ذریعہ ان کو یک قلم مٹا دینے کی منظم کوشش ہو رہی تھی۔

فرقہ وار فیصلہ کے خلاف بنگال میں[1]، اور جداگانہ انتخاب کے خلاف پنجاب میں محاذ تیار کیا گیا تھا اور اردو کے مقابلہ میں "بھارتیہ ساہتہ سمیلن" کے نام سے ایک انجمن بنائی گئی تھی جس کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ملک میں ہندی کا پرچار کرے۔ خود کانگرس نے اس انجمن کی حمایت کی اور "ہندی ہندوستانی" کی عجیب وغریب ترکیب کو اپنی قومی زبان قرار دیکر سارے ملک میں ہندی پرچار کے لئے سند جواز فراہم کر دی۔

---

[1] فرقہ وار فیصلہ کے خلاف بنگال میں ایک جماعت بنائی گئی تھی جس نے اس کو

منسوخ کرنے کے لئے ایجی ٹیشن کی تجویز بھی اپنے پروگرام میں داخل کر لی تھی۔ اس جماعت کے افراد سارے ملک میں دورہ کرتے تھے اور ہندوؤں کو اس کے خلاف منظم کرتے جاتے تھے۔ اور کوئی پلیٹ فارم ایسا نہ چھوڑتے تھے جہاں سے اس کی برائی نہ کی جائے انتہا یہ کہ طلباء کے جلسوں تک میں اس کے خلاف زہر اگلا جاتا تھا۔ لیکن یہ ساری مخالفت اس طرح ہوتی تھی کہ فرقہ وار فیصلہ کے مقابل کا کوئی اور فیصلہ ان حضرات کے پاس نہ تھا اور نہ کبھی دل سے اس کی کوشش کی گئی کہ خود آپس میں فرقہ وار فیصلہ کا نعم البدل تلاش کر لیں۔ چنانچہ جب اس جماعت نے فرقہ وار فیصلہ کو منسوخ کرنے کے لئے وائسرائے کی خدمت میں ایک میموریل پیش کیا تھا تو وائسرائے نے یہی جواب دیا تھا کہ یہ فیصلہ اس وقت تک باقی رہیگا جب تک ہندوستان کی جملہ اقوام آپس میں متحد ہو کر اس کا نعم البدل نہ تلاش کر لیں۔ لیکن یہ جواب تو صرف ان لوگوں کو متاثر کر سکتا تھا جو فی الحقیقت ہندوستان کی دوسری اقوام کو ان کے مستقبل سے مطمئن بھی کرنا چاہتے ہوں لیکن جن کا مقصد یہ ہو کہ ہندوستان کی ساری قوموں کو نظر انداز کر دیں اور ہندوستان میں صرف اکثریت کا اقتدار قائم کر دیں وہ اس جواب سے کیا متاثر ہو سکتے تھے چنانچہ اس کے بعد بھی اس کی مخالفت بدستور جاری رہی اور اس لئے جاری رہی کہ فرقہ وار فیصلہ کو باقی رہنے سے ہندو اقتدار پر ضرب لگتی تھی۔

جداگانہ انتخاب کی مخالفت کو تو ہندو مہاسبھا نے گویا اپنا نصب العین بنا لیا تھا کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوتا تھا جس میں جداگانہ انتخاب کی کسی نہ کسی رنگ میں مخالفت نہ ہوتی ہو اور پھر اس مخالفت کا انداز دوستانہ شکایت جیسا نہیں ہوتا تھا نہ اس کی مخالفت میں کوئی آئینی دلیل پیش ہوتی تھی۔ اور نہ اس کا یہ مقصد ہوتا تھا

کہ مسلمانوں کی بدگمانی کو دور کرکے انہیں خود ہی جداگانہ انتخاب کے مطالبہ کو ترک کرنے پر آمادہ کیا جائے بلکہ مخالفت محض اس لئے کی جاتی تھی کہ یہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے اور اس سے انہیں فائدہ پہونچ رہا ہے (حالانکہ ہندوؤں کا اس میں کوئی آئینی نقصان بھی نہیں ہے) اور انداز مخالفت کا ایسا گندا اور گرا ہوا ہوتا تھا کہ ہندوؤں میں ہیجان پیدا ہو اور مسلمان اس سے مشتعل ہو جائیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بھائی پرمانند پنجاب ہندو مہاسبھا کے مشہور لیڈر کا یہ فرمان آج تک مسلمانوں کو یاد ہے جو انہوں نے ۱۹۳۵ء کے ہندو مہاسبھا کے اجلاس میں صادر فرمایا تھا:۔

"ہندوستان صرف ہندوؤں کا وطن ہے، مسلمان عیسائی اور دوسری قومیں جو ہندوستان میں آباد ہیں وہ بطور مہمان کے ہیں اور اسی وقت تک وہ یہاں رہ سکتی ہیں جب تک بطور مہمان کے رہیں"

بھائی پرمانند جی کا یہ ارشاد ایک شخص واحد کا ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ یہ فی الحقیقت ہندو اکثریت کے خیالات کا حقیقی ترجمان ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں کس طرح زہر پھیلایا جا رہا ہے اور کس طرح مسلمانوں کے قومی وجود کو محو کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

اسی طرح اردو زبان کا بھی معاملہ ہے، ظاہر ہے کہ اردو مسلمانوں کی مخصوص زبان نہیں ہے، اسے مسلمان اپنے ساتھ ہندوستان نہیں لائے تھے بلکہ یہ ہندوستان ہی میں بنی تھی، اور اس لئے بنی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اظہار خیال کا ایک موثر ذریعہ تھی، اس اعتبار سے یہ کسی مخصوص قوم کی زبان نہیں ہے بلکہ سارے ملک کی مشترکہ زبان ہے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی دونوں کی میراث ہے۔ لیکن ہندوں کو اب یہ بھی گوارا نہیں کہ وہ ایسی زبان بھی بولیں جس میں مسلمان ان کا

شریک ہو جائے۔ وہ ایسی کوئی چیز ہندوستان میں باقی نہیں رکھنا چاہتے جس کے سنوارنے میں ذرا بھی مسلمانوں کا ہاتھ ہو اس لئے کہ اس سے ہندوؤں کی جداگانہ قومی تعمیر میں رخنہ پڑتا ہے!

چنانچہ آریہ سماج کی کانفرنس میں کبھی بھائی پرمانند جی زبان کے مسئلہ پر تقریر کرتے ہوئے یوں گوہر افشاں ہوتے ہیں:—

"اردو بدیشی زبان ہے اور ہماری غلامی کی زندہ یادگار ہے اس زبان کو صفحہ ہستی سے مٹا دینا چاہئے۔ اردو نے جو ملیکشوں کی زبان ہے ہندوستان میں رواج پاکر ہمارے قومی مقاصد کو سخت نقصان پہنچایا ہے" (سیاست وطنی صا۱۴)

یہ تو بھائی پرمانند جی تھے جو کٹر مہاسبھائی واقع ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے خلاف جسقدر بھی زہر اگلیں کم ہیں لیکن کانگرس جو ہندوستان کی واحد قومی نمائندہ جماعت بننے کا دعوے کرتی ہے اس کے مسلمہ لیڈر گاندھی جی نے ساہتیہ سمیلن ناگپور کے جلسہ میں اردو کے متعلق جو ارشاد فرمایا وہ سننے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:—

"اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے، قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے مسلمان بادشاہوں نے اسے اپنے زمانہ حکومت میں بنایا اور پھیلایا تھا"

گاندھی جی کے اس بیان کے بعد اردو کے متعلق کانگرسی اور غیر کانگرسی ہندوؤں کی ذہنیت پر روشنی ڈالنے کے لئے کسی مزید شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔

دراصل ہندوؤں کی یہی وہ فرقہ وارانہ ذہنیت ہے جو قوم پرستی کے روپ میں ہندوستان کی فرقہ وارانہ فضا کو بیدار رکھتی ہے۔ اور آپس کی کشیدگی کو کسی وقت

کبھی دور نہیں ہونے دیتی۔

لیکن ستم ظریفی ملاحظہ ہو، ایک طرف تو مسلمان اور ان کے سیاسی مطالبات کے خلاف اس انداز سے زہر اگلا جا رہا تھا دوسری طرف بابو راجندر پرشاد صدر کانگریس نے مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کو جو انہوں نے وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلہ پہ اسمبلی میں دیا تھا، بنیاد قرار دیکر، فرقہ وارانہ مسئلہ کو طے کرنے کے لئے مسٹر جناح سے گفتگو شروع کر دی۔ خط کتابت کے بعد مسٹر جناح اور بابو راجندر پرشاد کی آپس میں ملاقاتیں بھی ہوئیں۔ مسٹر جناح نے ہندوؤں کی زہریلی ذہنیت کا علم رکھنے کے باوجود اپنی طرف سے اس ناگوار بحث کو ختم کرانے میں پوری پوری کوشش کی لیکن عین اس وقت جبکہ بابو راجندر پرشاد اور مسٹر جناح کی کوششیں ایک موزوں فارمولا مرتب کرنے میں کسی قدر کامیاب ہو رہی تھیں ہر طرف سے ہندوؤں نے اس کی سختی سے مخالفت شروع کر دی اور یہ مسئلہ وہیں کا وہیں ختم ہو کر رہ گیا۔

یہ اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوؤں کے بعض آزاد خیال افراد ہندو مسلم اختلافات کو فی الحقیقت دل سے مٹانا چاہتے ہیں، تب بھی کانگرسی ہندوؤں کی اس ذہنیت کی کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی جو کانگرس کے اندر اور کانگرس کے باہر اُن سے فرقہ وار مسائل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ کٹر فرقہ پرست ہندوؤں کے اشتعال انگیز اقوال و اعمال پر ان لوگوں کی خاموشی بھی کچھ کم معنی خیز نہیں محسوس ہوتی خصوصاً ان مسائل میں جن سے فرقہ وارانہ منافرت بڑھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

یہ مسئلہ اس قدر پیچیدہ اور اہم نہیں ہے کہ حل نہ ہو سکے۔ دل کی صفائی شرط ہے اگر مسلمانوں کو اس معاملہ میں ہندو ذہنیت کے متعلق غلط فہمی ہے تو وہ رفع ہو سکتی ہے اور اگر اس میں فی الحقیقت متعصب قسم کے فرقہ پرست ہندوؤں کی

زیادتی ہے تو وہ بھی دور کی جا سکتی ہے ۔ مگر محض دکھاوے کی کوششوں سے
نہیں ـــــــــ اخلاص اور ایثار سے!!
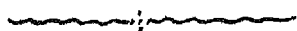
انیسواں باب

مسجد شہید گنج اور احرار

"احرار اسلام" کے نام سے ۱۹۲۹ء میں جو جماعت مسلمانوں کی پنجاب میں قائم ہوئی تھی اس نے اپنا پروگرام پہلے تو کانگریس کے ساتھ بنایا اور سول نافرمانی کے زمانہ میں کانگریس کا ساتھ دیا لیکن جب "گاندھی اردن" سمجھوتے کے بعد سول نافرمانی بند ہوگئی تو احرار نے اپنی عنان توجہ کشمیر کی طرف پھیر دی وہاں اس زمانہ میں ریاست کے خلاف کشمیری ہندؤں اور مسلمانوں کا ایجی ٹیشن ہو رہا تھا اور ریاست سے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ کشمیری رعایا کو حکومت میں دخیل کیا جائے احرار نے اپنے جتھے کشمیر بھیج بھیجکر اس ایجی ٹیشن کو بڑی تقویت پہونچائی اور ہزاروں کی تعداد میں اپنے آپکو گرفتاریوں کے لیئے پیش کر کر کے ریاست کشمیر کو مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے۔ مشہور ہے کہ محض اس ایجی ٹیشن کے قیدیوں کی خوراک وغیرہ پر ریاست نے قرض لیکر ۲۴ لاکھ روپیہ خرچ کیا۔ غرض احرار کی مدد سے کشمیر ایجی ٹیشن کامیاب رہا ریاست کشمیر مجبور ہوگئی کہ وہ کشمیر ایجی ٹیشن کے لیڈروں سے گفت وشنید کرے۔

احرار کے اس اقدام نے پنجاب کے مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ بہت متاثر کیا اور جب احرار کشمیر سے کامیاب واپس ہوئے تو ہر طرف ان کے ایثار اور قربانیوں

کے چرچے ہو رہے تھے۔ کشمیر ایجی ٹیشن کو ختم کر چکنے کے بعد احرار کے پاس کوئی مخصوص پروگرام تو تھا نہیں "قادیانیوں" ہی کے خلاف مہم شروع کر دی وہ جتھے جو کشمیر کی جیلوں سے چھوٹ چھوٹ کر آتے تھے "قادیان" بھیجدیئے جاتے۔ جہاں وہ مورچہ لگا کر بیٹھ جاتے تھے۔ احرار کی اس حرکت سے "قادیانی" بڑے پریشان ہوئے پہلے تو انہوں نے اس بلا کو دھمکیوں ہی سے ٹالدینا چاہا لیکن جب دیکھا کہ یہ لوگ بڑے سخت جان ہیں اور محض دھمکیوں سے ٹلنے والے نہیں ہیں تو قادیان کے خلیفہ صاحب نے گورنر پنجاب سے ان کی شکایت کی اور احراری مصیبت سے نجات پانے کے لئے باقاعدہ حکومت پنجاب سے امداد چاہی۔ خلیفہ صاحب کے اس اقدام سے احراریوں کی سرگرمیاں بہت تیز ہو گئیں اور پریس اور پلیٹ فارم دونوں طرف سے قادیان اور قادیانیوں پر لعنت و ملامت کی بارش ہونے لگی حالات نازک ہوتے جا رہے تھے مجبوراً حکومت نے ان دونوں کے جھگڑے میں مداخلت کی اور احرار کو یہ حکم دیا کہ وہ قادیان کے حدود میں نہ قدم رکھیں اس حکم کے ساتھ ہی احرار اور قادیانیوں میں باقاعدہ فساد ہوئے اور عدالتوں میں مقدمہ بازیاں شروع ہو گئیں اور احراریوں نے مرزائیوں کے خلاف جہاد کو اپنا مستقل مشغلہ بنا لیا۔ ابھی آپس میں یہ نوک جھونک چل ہی رہی تھی کہ نئے دستور کے نفاذ کا زمانہ قریب آ گیا اور احراریوں نے مرزائیوں کے خلاف جہاد کو کچھ دنوں ملتوی کر کے صوبہ پنجاب میں اپنے سیاسی اقتدار کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

اسوقت پنجاب کے لیڈر میاں سر فضل حسین تھے جن کا پنجاب کے ہر طبقہ پر ذاتی اثر تھا' احرار کو اس صوبہ میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے ان ہی سے ٹکر لینی تھی۔ کوشش شروع ہوئی کہ میاں سر فضل حسین کے مقابلہ میں پنجاب میں

احرار کا قدم جم جائے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ احراری سیاست سے محض ناواقف تھے ان کی کارگذاریاں اگر کچھ تھیں تو صرف کشمیر ایجی ٹیشن میں شرکت اور مرزائیوں کے خلاف جہاد پر مشتمل تھیں جنہیں سیاست کی مصلحت اندیشیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ برخلاف اس کے میاں سر فضل حسین بحر سیاست کے پرانے غواص تھے اور پنجاب ایک سے زائد مرتبہ انہیں آزما چکا تھا جب مقابلہ اس قدر نا برابر کا ہو تو ظاہر ہے کہ سر فضل حسین ایک معمولی سی غیر منظم جماعت کو جس کا سرمایہ محض جوش و خروش کے سوا اور کچھ نہ تھا کیا خاطر میں لا سکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احرار کا سر فضل حسین کے آگے چراغ نہ جل سکا۔ لیکن اسی دوران میں یہ قضائے الٰہی سر فضل حسین کا انتقال ہو گیا۔ اور پنجاب کی قیادت سر سکندر حیات خاں کے حصہ میں آئی۔ اور سر سکندر نے پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں کی مدد سے "یونینسٹ" کے نام سے ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد ڈال دی۔ سر فضل حسین کے انتقال کے باعث احرار کے جو حوصلے بڑھ چکے تھے، سمجھے کہ سر سکندر کے ہاتھ سے پنجاب کی قیادت چھین لینا آسان ہو گا۔ تازہ دم ہو کر پھر جد و جہد شروع کر دی اور اب کے اپنے ساتھ سکھوں کو بھی شریک کر لینے کی طرح ڈالی لیکن ابھی یہ "یونینسٹ" پارٹی سے مقابلہ کا نقشہ مکمل نہ کرنے پائے تھے کہ ایک اور نئی مصیبت ان پر نازل ہو گئی اور یہ اس بری طرح اس میں الجھے کہ پنجاب میں اقتدار حاصل کرنے کا سوال تو رہا ایک طرف خود اپنی جماعت کے وقار اور مقبولیت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔
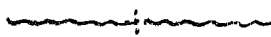
یہ نئی مصیبت مسجد شہید کا قضیہ تھا۔ یہ مسجد مدتوں سے سکھوں کے قبضہ میں چلی آتی تھی اور پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں میں اس پر بہت عرصہ پہلے مقدمہ بازی بھی ہو چکی تھی لیکن قبضہ اس پر برابر سکھوں ہی کا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں

سکھوں کو اپنے گردوارے کی توسیع کا خیال آیا اور چونکہ یہ مسجد بھی گردوارے کے اندر واقع ہوئی تھی سکھوں نے اس کی شکل تبدیل کر کے اسے بھی گردوارے کا ایک جزو بنا لینا چاہا۔ چنانچہ سکھوں نے حکومت پنجاب سے اس کی اجازت طلب کی حکومت پنجاب کو اس میں کیا عذر ہو سکتا تھا مسجد سکھوں کی "مقبوضہ" تھی اس نے اس کو ڈھانے کی اجازت دیدی۔ یہ کارروائی عین اس وقت ہوئی جب سکھوں اور احراریوں کے درمیان دوستی کی ابتدا ہو چکی تھی اور اس بات کا قرینہ پیدا ہو گیا تھا کہ یونینیسٹ پارٹی کے مقابلہ میں آئندہ انتخاب کے موقع پر "احرار سکھ اتحاد" قائم ہو جائیگا۔

لاہور کے مسلمانوں میں اس حکم سے بےچینی پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کی ایک جماعت فوراً اس حکم کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کے لئے میدان میں اتر آئی سارے شہر میں سنسنی پھیل گئی اور ہزاروں مسلمان ایجی ٹیشن میں حصہ لینے اور مسجد شہید گنج پر قبضہ کرنے کے لئے شہر کے باہر جمع ہونے شروع ہو گئے۔ سکھوں نے جو یہ صورت دیکھی تو حکومت کی مدد سے فوراً اس مسجد کو ڈھا دیا کہ نہ یہ باقی رہیگی نہ فساد ہو گا۔ لیکن اس کا اثر مسلمانوں پر الٹا ہوا۔ مسجد کے ڈہائے جانے کی اطلاع ملتے ہی وہ بے قابو ہو گئے اور جتھے بنا بنا کر نہایت جوش و خروش کے ساتھ مسجد شہید گنج پر حملے کرنے شروع کر دیئے۔ حکومت نے اپنی پوری قوت سے مسلمانوں کو روکا۔ لیکن آگ لگ چکی تھی، علاقہ پنجاب اور سرحد سے مسلمانوں کے جتھے سول نافرمانی کرنے کے لئے لاہور آنے شروع ہو گئے اور سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں برہمی اور بےچینی پھیل گئی۔

صورت حال دیکھتے ہی دیکھتے نازک ہو گئی مسلم سکھ فسادات کی رفتار بڑھ گئی

اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ پنجاب کی سرزمین سکھوں اور مسلمانوں کے خون سے لالہ زار نہ بن جاتے۔ اس موقع پر مسلمانوں کے مذہبی لیڈروں کی پوزیشن بڑی نازک تھی انہیں لاہور بلایا جا رہا تھا اور وہ منہ چھپائے بیٹھے تھے۔ وہ دراصل اس مخمصے میں گرفتار تھے کہ لاہور جا کر آخر مسلمانوں کو سمجھائیں تو کیا سمجھائیں؟ مسجد پر غیر قوم کے قبضہ اور ڈھائے جانے کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے کے لئے یہ پہلے ہی فتوے دے چکے تھے اب یہ وہاں جا کر کس طرح کہہ سکتے تھے کہ مسلمان ایجی ٹیشن بند کر دیں اور سکھوں سے صلح صفائی کے ساتھ اس قضیہ کو نپٹ لیں؟۔

رہے دوسرے لیڈر، معاملہ مذہبی تھا، مسلمان بے انتہا مشتعل تھے، ایک ہلکی سی لغزش بھی ان لیڈروں کی ساری عمر کی سرگرمیوں پر پانی پھیر دینے کو کافی تھی اس لئے کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ اس معاملہ میں دخل دے۔

آخر مسٹر محمد علی جناح اس نازک فرض کو انجام دینے کے لئے اٹھے۔ لاہور پہونچ کر ایک طرف تو انہوں نے مسلمانوں کا ایجی ٹیشن بند کروایا دوسری طرف حکومت اور سکھوں سے مسجد کی واپسی کے متعلق گفتگو کی۔ فضا میں کسی قدر سکون پیدا ہوا جذبات کے بجائے مسلمان دماغ سے کام لینے لگے۔ طے یہ ہوا کہ مسجد شہید گنج کو حاصل کرنے کے لئے مسلمان آئینی طریقہ اختیار کریں اور فوراً سکھوں کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کر دیں۔ صورت حال قابو میں آگئی اور ہنگامہ فرو ہو گیا۔

لیکن احرار کا اس سارے ہنگامہ میں کہیں پتہ نہ تھا۔ ہزاروں مسلمان جیل چلے گئے، سینکڑوں زخمی ہوئے اور بیسیوں شہید ہو گئے لیکن احرار کا ان میں سے کسی میں بھی شمار نہ تھا۔ وہ جماعت جو ایجی ٹیشن ہی کرتے رہنے کے لئے پیدا ہوئی تھی اس اہم اور نازک موقع پر کیوں پیچھے رہ گئی؟ اسلامی مفاد کے حفاظت کا

دعوے اور اسلامی مفاد سے یہ غداری؟ مسلمانوں کے اس احتساب سے احرار چونکے انہیں مغالطہ تھا کہ ان کی اسلامی خدمات ایسی اہم ہیں کہ شاید مسلمان ان سے محاسبہ نہ کریں گے لیکن جب سب طرف سے ان پر لعنت ملامت کی بوچھار شروع ہوئی تو انہیں اپنی صفائی کرنی پڑی۔ لیکن ان کی صفائی عذر گناہ بدتر از گناہ قرار دی گئی اسلئے کہ انہوں نے مسجد شہید گنج کے اس سارے ہنگامے کو ایک فعل عبث قرار دیا۔ اور جو مسلمان اس راہ میں شہید ہوئے تھے ان کے متعلق کچھ نازیبا الفاظ استعمال کر ڈالے۔ مسلمان اس شوریدہ سری کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احرار سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی نظروں سے گر گئے اور پنجاب میں جہاں یہ سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی تمنا میں سکھوں سے اتحاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے ان کی اس قدر بے وقعتی ہوئی کہ پھر انہیں دستور جدید کے انتخابات میں حصہ لینے کی جرأت ہی نہ ہو سکی۔

اس ایک لغزش کے بعد احرار بہ حیثیت جماعت ختم ہو گئے۔ اور خلافت کمیٹی کی طرح جس کا یہ کسی زمانہ میں ایک جزو تھے بے جان ڈھچر بن کر رہ گئے۔
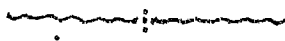
بیسواں باب

دستور جدید کا نفاذ اور مسلم لیگ کا احیاء

اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا اجلاس سر وزیر حسن کی زیر صدارت بمبئی میں ہوا، یہ اجلاس کئی وجوہ سے اہمیت رکھتا ہے۔ اسی اجلاس میں لیگ کے دستور اساسی میں مسلمانوں کی سیاسی ضروریات کے پیش نظر مناسب ترمیم کے لئے کمیٹی بنی اور گول میز کانفرنس کی تجویز کردہ مرکزی وفاق کی مخالفت کی گئی اور ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں "صوبائی خود مختار" حکومتوں کے قانون کا جو نفاذ ہونیوالا تھا اس کے متعلق بھی اپنا عملی پروگرام مرتب کیا گیا۔

اس اجلاس میں "پراونشل اٹانمی" کے متعلق لیگ نے یہ فیصلہ کیا کہ ملک میں اسوقت جو حالات پائے جاتے ہیں ان کے پیش نظر جدید دستور کو قبول کرلیا جائے اگرچہ اس میں نقائص بہت ہیں اور ان کی موجودگی میں مجالس قانون ساز کی ذمہ داریاں بے حقیقت سی رہ جاتی ہیں تاہم اس وقت مناسب یہی ہے کہ ان اصلاحات سے جس قدر فائدہ حاصل کیا جا سکے حاصل کرلیا جائے۔

اسی کے ساتھ یہ طے پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ انتخابات میں اپنے امیدوار پیش کرے اور مسٹر محمد علی جناح کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنی ماتحتی

میں ایک پارلیمنٹری بورڈ قائم کریں جس میں کم سے کم (۳۵) ممبر شامل ہوں اور صوبوں کے عام انتخابوں میں مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

پارلیمنٹری بورڈ قائم کر لینا آسان تھا لیکن انتخابی مہم میں مسلمانوں کی رہنمائی کرنا بہت مشکل تھا اس لئے کہ مسلمانوں میں کوئی تنظیم نہیں تھی اور نہ وہ کسی مرکز پر متحد تھے اس انتشار اور لامرکزیت کی باعث دراصل وہ چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتیں تھیں جو مذہب کے نام سے وقتی حالات کے ماتحت عالم وجود میں آ گئی تھیں اور جنہوں نے اپنے جماعتی اقتدار کی خاطر مسلمانوں کو پارٹی بازی کے چکر میں پھنسا دیا تھا۔ ان جماعتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو ایک مرکز پہ جمع کرنے کی سعی کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم لیگ ان سب سے مقابلہ کرتی یا پھر انہیں اپنے میں ضم کر لیتی۔ مقابلہ کی صورت میں انتشار مسلمانوں میں بدستور باقی رہتا تھا البتہ ان پارٹیوں کے اتحاد سے مسلمانوں کی ایک مرکزیت قائم ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ مشکل کام تھا۔ مگر مسٹر محمد علی جناح نے ہمت نہ ہاری پارلیمنٹری بورڈ کے قیام کے بعد انہوں نے ملک کا دورہ کیا، جگہ جگہ مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں مسلمانوں میں سرگرمی عمل پیدا کی اور انہیں آمادہ کیا کہ بے معنی جوش وخروش کو چھوڑ کر اپنی قومی تعمیر کے لئے ٹھوس کام کریں۔

اس طرح مسلم لیگ مدت تک کس مپرسی کا شکار رہنے کے بعد ایک مرتبہ پھر ابھری اور اس نے ہندوستانی مسلمانوں کی رہنمائی کا اہم فرض اپنے ذمہ لے لیا۔

شروع ۱۹۳۷ء میں نئے دستور کے ماتحت صوبوں میں عام انتخابات شروع ہوئے مسلم لیگ بھی میدان عمل میں آئی، صرف چند مہینے کی تنظیمی جدوجہد کے بعد یہ توقع تو نہیں تھی کہ مسلم لیگ کو اس انتخاب میں بہت

زیادہ کامیابی ہو سکتی ہے تاہم عام انتخابات میں اور انتخابات کے بعد صوبوں میں مسلم لیگ کے گروپ قائم ہو گئے۔ اور مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی انتخابات کے سلسلہ میں لیگ پارلیمنٹری بورڈ نے ذیل کا طویل بیان (مینی فسٹو) شائع کیا تھا۔

(۱) مسلمانوں کے مذہبی حقوق کی حفاظت۔
(۲) تشدد آمیز قوانین کی تنسیخ کی سعی۔
(۳) ان تمام قوانین کی مخالفت جو ہندوستان کے مفاد کے لئے مضر ہوں، افراد کے حقوق پر اثر انداز ہوں یا ملک میں اقتصادی تصرفات کا دروازہ کھولدیں۔
(۴) ملک کے نظم و نسق کے خرچ کو کم کر کے آمدنی کا بڑا حصہ ملک کے تعمیری اداروں پر خرچ کرنا۔
(۵) ہندوستان کا فوجی خرچ گھٹانا اور فوج کو ہندوستانی بنانا۔
(۶) ملک کی صنعتوں کو فروغ دینا۔
(۷) کرنسی مبادلہ اور قیمتوں کو ملک کے اقتصادی فائدے کے مطابق منظم کرنا۔
(۸) اور وطنی قرضوں میں تخفیف کے لئے قواعد بنانا۔
(۹) ابتدائی تعلیم کو عام اور لازمی بنانا۔
(۱۰) اردو زبان اور رسم الخط کی حفاظت کرنا۔
(۱۱) دیہاتی آبادی کی اقتصادی، معاشرتی اور تعلیمی فلاح کی کوشش کرنا۔
(۱۲) مسلمانوں کی حالت کو مجموعی حیثیت سے بہتر بنانے کی تدابیر

اختیار کرنا۔

(۱۳) ہندوستانیوں پر سے محاصل کے بوجھ کو کم کرنا۔

(۱۴) ملک میں صحیح رائے عامہ اور عام سیاسی بیداری پیدا کرنا۔

اسی کے ساتھ مسلم لیگ پارٹی کا نصب العین یہ متعین کیا گیا تھا:۔

(۱) موجودہ پروونشل اٹانمی اور مجوزہ فیڈرل اسکیم کو بدل کر اسکی جگہ ڈموکریٹک سلف گورنمنٹ قائم کرنا۔

(۲) جب تک یہ مقصد حاصل نہ ہو مسلم لیگ مختلف مجالس قانون ساز کے ذریعہ وہ مفاد حاصل کرنے کی کوشش کرے گی جو اہل ملک کی قومی زندگی اور ان کی فلاح و ترقی کے لئے ضروری ہونگے

پراونشل اٹانمی کے متعلق کانگریس کی پوزیشن یہ تھی کہ آل انڈیا کانگریس نے اسے اپنے اجلاس میں غیر اطمینان بخش، رجعت پسندانہ، اور نا قابل قبول بتایا لیکن طے یہ کیا کہ کانگرسی دستور جدید کے ماتحت انتخاب میں حصہ ضرور لیں اور کونسلوں میں پہونچ کر دستور جدید کے نفاذ کو بے اثر بنا دیں چنانچہ اس قرارداد کے مطابق کانگرس کی طرف سے جو انتخابی اعلان شائع ہوا اس میں بھی یہ صراحت کردی گئی اور دیہات سدھار کے کانگرسی پروگرام کو بھی اس میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۳۷ء کے اوائل میں انتخابات شروع ہوئے کانگرس نے نہایت سرگرمی سے اس میں حصہ لیا اور (۱۱) صوبوں میں سے (۷) صوبوں میں اکثریت حاصل کر لی۔ اس کامیابی کے بعد کانگرس کے آگے یہ سوال درپیش تھا کہ آیا عہدے قبول کئے جائیں یا نہ کئے جائیں جن صوبوں میں کانگرس کو

اکثریت حاصل ہو گئی تھی ان میں دستور کے مطابق انہیں وزارتیں بنانی تھیں اب اگر کانگرسی ان صوبوں میں وزارتیں بناتے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ انہوں نے جدید دستور کو منظور کر لیا اور نہیں بناتے تو کوئی رجعت پسند پارٹی کی وزارت قائم ہو جاتی جو کانگرس کے مفاد کے خلاف پڑتی اس مشکل کو بھی کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے حل کر دیا اور یہ تصفیہ کر دیا کہ جن صوبوں میں کانگرس کی اکثریت ہے وہاں کانگرسی اپنی وزارتیں بنا لیں لیکن وزارت بنانے سے پہلے گورنروں سے یہ طے کر لیں کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر کانگرس کے پروگرام میں مداخلت نہ کریں گے۔ اس مرحلہ کو طے کرنے کے بعد کانگرسیوں نے اپنی اکثریت کے صوبوں میں وزارتیں بنانے پر آمادگی ظاہر کر دی لیکن دقت یہ پیش آگئی کہ گورنر یہ طمانیت دینے کو تیار نہ ہوئے کہ وہ اپنے اختیارات خصوصی کو معطل کر دیں گے نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس نے وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا۔ اس انکار کے بعد ان ساتوں صوبوں کی کونسلوں کی مسلم لیگ پارٹیوں کو گورنروں نے ترتیب وزارت کی دعوت دی لیکن مسلم لیگ نے بھی گورنروں کی یہ دعوت منظور نہیں کی مجبوراً حکومت کو عارضی وزارتیں قائم کرنی پڑیں۔

عارضی وزارتوں کے قیام کے بعد کانگرس اور حکومت میں بدمزگی پیدا ہوتی گئی اور یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں پھر ملک میں انقلابی جدوجہد نہ شروع ہو جائے۔ اس اندیشہ کو دور کرنے کے لئے حکومت نے کسی قدر مصالحت آمیز رویہ اختیار کر لیا، برطانوی پارلیمنٹ نے بھی اس کشمکش کو دور کرنے میں مدد دی اور وائسرائے نے بھی اپنے بیانوں میں صلح صفائی کی کوشش کی بالآخر

حکومت اور کانگریس میں اس بات پر صفائی ہو گئی کہ صوبوں کے گورنر بے وجہ کانگریسی وزارتوں کے تعمیری پروگرام میں مداخلت نہ کریں گے۔ اس تصفیہ کے بعد کانگریس نے ساتوں صوبوں میں اپنی وزارتیں بنا ڈالیں اور وزارتوں کی رہنمائی کے لئے ایک پارلیمنٹری بورڈ بنا دیا اور جدید دستور کے مطابق ملک میں کام شروع ہو گیا" لیکن کانگریس نے کونسلوں میں جو وزارتیں بنائیں وہ پارٹی پالیسی کے اصول پر بنائیں ملک کی دوسری سیاسی جماعتوں کو ان عہدوں اور وزارتوں میں حصہ نہیں دیا۔ اصولاً تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی ۔ اسلئے کہ کونسلوں میں جس سیاسی پارٹی کو اکثریت حاصل ہوتی ہے وہی وزارت بناتی ہے اور دوسری پارٹیاں "اپوزیشن" میں چلی جاتی ہیں لیکن جو بات قابل اعتراض تھی وہ یہ تھی کہ کانگریس نے وزارتیں سنبھالتے ہی ملک کی دوسری ساری سیاسی پارٹیوں کو نظر انداز کر دیا اور دعوے کرنا شروع کیا کہ ملک میں صرف دو ہی پارٹیاں ہیں ایک کانگریس دوسری حکومت! اس دعوے کے معنی یہ تھے کہ ملک میں کانگریس کے علاوہ کوئی ایسی سیاسی پارٹی ہی نہیں ہے جسے ملک کی نمائندگی کا حق حاصل ہو سکے۔ اور یہ بات جھگڑے کی تھی سب سے پہلے مسلم لیگ نے کانگریس کے اس دعوے کی تغلیط کی اور یہ ثابت کیا کہ کانگریس ہی ملک کی نمائندہ جماعت نہیں ہے بلکہ مسلم لیگ بھی ملک کی ایک نمائندہ جماعت ہے۔

کانگریس کی طرف سے اس دعوے کے بعد مسلم لیگ نے بڑی سرگرمی سے اپنی تنظیم شروع کر دی ۱۹۳۷ء میں لیگ کی وزارت قائم ہو چکی تھی بنگال اور پنجاب میں آزاد حکومتیں تھیں انہیں بھی لیگ میں شامل کیا گیا

سندھ میں البتہ لیگ کو کامیابی نہ ہوسکی اس لئے سندھ کونسل میں لیگ پارٹی کو مضبوط اپوزیشن پارٹی بنا دیا گیا۔ لیگ کی ان سرگرمیوں کو دیکھ کر کانگرس نے مسلمانوں میں نہایت تیزی سے "ماس کنٹاکٹ" کی تحریک صدر کانگرس پنڈت جواہر لال کی نگرانی میں شروع کر دی اور اسی سلسلہ میں کانگرس نے خود ان مسلمانوں کو آلہ کار بنایا جو کانگرس میں شریک تھے اور اپنے آپ کو "نیشلسٹ مسلم" کہتے تھے[۵] مسلم لیگ کی طرف سے کانگرس کے اس اقدام کا فوراً اور موثر جواب پیش ہوا ہر شہر و قصبہ میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم ہونی شروع ہو گئیں اور مسلم پریس اور پلیٹ فارم سے پورے انہماک کے ساتھ مسلمانوں کی قومی تنظیم کا کام شروع ہو گیا اور ساتھ ہی ضمنی انتخابات کے سلسلہ میں جگہ جگہ کانگرس اور لیگ کے مقابلہ ہونے لگے۔

کانگرس نے لیگ کو چیلنج کیا تھا مسلم لیگ نے اسے قبول کر لیا!

ع۵۔ نیشلسٹ مسلمانوں کے علاوہ احرار اور جمعیتہ العلماء نے بھی کانگرس کی اس تحریک کو کامیاب بنانے میں پورا پورا زور خرچ کر ڈالا۔ ان جماعتوں نے مسلم لیگ اور اس کے لیڈروں کے خلاف افترا پردازی بھی کی اس کے سیاسی مسلک کو مسخ کر کے اس کے خلاف مسلمانوں نے بدگمانی بھی پھیلائی اور ان حرکتوں کے ساتھ ساتھ اپنے پرانے مشغلہ یعنی لیگ کے خلاف فتوے سازی سے بھی مسلمانوں کو گمراہ اور مشتعل کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ سب کچھ کانگرسی لیڈروں کے اشارے اور "کانگرسی فنڈ" کے بل پر ہوا۔ (مولف)

اکیسواں باب[21]

مسلم لیگ میدان عمل میں

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح جس جوش و خروش کے ساتھ منعقد ہوا لیگ کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی۔ ہر حصہ ملک کے مسلم نمائندے اس جلسہ میں موجود تھے اور اس عزم و احساس کے ساتھ موجود تھے کہ اپنی جداگانہ قومیت کی تعمیر کا خاکہ انہیں بنانا ہے اور ملک پر یہ ثابت کرنا ہے کہ مسلمانوں کا وجود سیاسی حیثیت سے ایسا ناچیز نہیں ہے کہ حکومت یا کانگرس اسے نظر انداز کر سکے اسی اجلاس میں مسلم لیگ کا نصب العین "ہندوستان میں مکمل آزادی کا حصول" قرار پایا جس کی شکل آزاد جمہوری ریاستوں کے فیڈریشن جیسی ہو۔ مجوزہ فیڈریشن کو نامنظور کیا گیا۔ فلسطین کی برطانوی پالیسی کی مذمت کی گئی اور مسلمانوں کی زبان اور معاشرت کے تحفظ کا مطالبہ کیا گیا وغیرہ اس موقع پر مسٹر محمد علی جناح نے خطبہ بھی معرکہ آرا پڑھا اس میں ایک طرف انہوں نے برطانوی حکومت کی سیاسی چالبازیوں کا جائزہ لیا اور دوسری طرف کانگرس اور ہندوؤں کی ذہنیت پر نہایت سخت احتساب کیا اور

مسلمانوں کو یہ تلقین کی کہ وہ ان دونوں کے مقابلے میں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ایک مرکز پر متحد ہو جائیں۔

گذشتہ چھ مہینے کی لیگ کی انتخابی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر جناح نے فرمایا:۔

"صرف چھ ماہ کی مختصر سی مدت میں مسلم لیگ پارلیمنٹری بورڈ کی کوششوں سے لیگ کے امیدوار جس جگہ کھڑے ہوئے ۶۰ اور ۷۰ فیصدی نشستوں پر قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گئے انتخابات کے بعد مدراس سے سرحد تک سیکڑوں شاخیں مسلم لیگ کی قائم ہو چکی ہیں اور ابریل سے اب تک مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مسلم لیگ میں شامل ہو چکی ہے مجھے یقین واثق ہے کہ اگر مسلمان مسلم لیگ کی پالیسی کو صحیح طور پر سمجھ جائیں تو پھر بلا کسی استثنار کے ہندوستان کے سارے مسلمان لیگ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے"

کانگرسیوں کے غرور و نخوت اور بے اصولیوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا:۔

"اکثریت والے چھ صوبوں میں جب سے کانگرسیوں نے وزارتیں قائم کی ہے اسوقت سے انہوں نے اپنے اقوال و اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ حق و انصاف محض خیالی باتیں ہیں جن پر وہ عمل نہیں کر سکتے۔ جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں انہوں نے مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور یہ مطالبہ کیا کہ لیگ بغیر کسی شرط کے کانگرس کے عہد نامے پر دستخط کر دے"

"———— ہندی کو ہندوستان کی قومی زبان اور بندے ماترم کو قومی ترانہ کہا جاتا ہے اور کانگرس کے جھنڈے کا احترام بلا تخصیص ہر شخص کے لئے لازمی قرار دیدیا گیا ہے غرض ان محدود اختیارات ہی کے نشہ سے سرشار ہو کر ہندوؤں نے یہ جتا دیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے اور اس میں دوسری قوموں کی گنجائش نہیں ہے"

مسلمانوں کی لامرکزیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:-

"میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ مسلمانوں میں تفریق ہے ان میں سے ایک گروہ تو وہ ہے جو برٹش گورنمنٹ کی طرف اپنا رخ کئے ہوئے ہے اگر اس کے نتائج سے وہ بے خبر ہے تو وہ ہمیشہ بے خبر رہیگا۔ خدا صرف ان کی مدد کرتا ہے جو خود اپنی مدد کرتے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کا رخ کانگرس کی طرف ہے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اپنی ذات پر بھروسہ نہیں رہا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان صرف اپنے اوپر بھروسہ کرنا سیکھیں اور اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں"

ہندو مسلم سمجھوتے کے امکانات کا جائزہ لیتے ہوئے فرمایا:-

"اکثریت سے کسی سمجھوتے یا مفاہمت کا امکان نہیں کیونکہ کانگرس کا کوئی ہندو لیڈر جو صاحب اثر و اختیار ہو اس کی طرف دل سے توجہ ہی نہیں کرتا۔ باعزت سمجھوتا صرف برابر کے فریقین میں ہوتا ہے اور تاوقتیکہ دونوں فریق ایک دوسرے کی عزت اور طاقت کو محسوس نہ کریں اسوقت تک سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی"

کانگرسی مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں کو بلا شرط کانگرس میں شریک ہو جانے کی

جو تلقین کی جا رہی ہے اس پر مسٹر جناح نے سختی سے اعتراض کرتے ہوئے کہا :-

"کانگریسی مسلمان شدید غلطی کرتے ہیں جب وہ مسلمانوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ غیر مشروط طور سے کانگریس میں ضم ہو جائیں۔ اس سے بڑھ کر شکست خوردہ ذہنیت کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں اور اس سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ اور کیا دشمنی اور غداری ہو سکتی ہے۔ اگر اس پالیسی پر عمل کیا گیا تو میں آپ کو متنبہ کرتا ہوں کہ مسلمان اپنے قتل نامہ پر خود مہر لگا دیں گے۔ اور پھر وہ ملک اور حکومت کی قومی زندگی میں جماعتی حیثیت سے خود فنا ہو جائیں گے۔ صرف ایک صورت مسلمانوں کو بچا سکتی ہے اور ان کی گئی ہوئی طاقت ان کو واپس دلا سکتی ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ مسلمان اپنی گمشدہ روح کو پھر بیدار کریں اور اس اعلیٰ اصول پر ثابت قدمی سے کاربند ہوں جو ان کے باہمی اتحاد اور ان کو ایک شیرازے میں منسلک کرنے کی بنیاد ہیں

ان آوازوں اور طعنوں سے ذرا بھی متاثر نہ ہونا چاہئے جو مسلمانوں کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً ، فرقہ پرست ، 'لوڈی'، 'یا رجعت پسند' ـــــــــــ دنیا بھر کا "بدترین فرقہ پرست" اگر آج کانگریس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور اپنے ہی بھائیوں کو لعنت ملامت کرنے لگتا ہے تو کل ہی وہ "قوم پرستوں کا سردار" بنا دیا جاتا ہے۔ یہ آوازے گالیاں اور طعنے محض اس واسطے دئے جاتے ہیں کہ مسلمانوں میں احساس کمتری پیدا ہو جائے اور وہ اپنے آپ کو حقیر و ذلیل سمجھنے لگیں (خطبہ صدارت مسٹر جناح ۱۹۳۷ء)

مختصر یہ کہ مسٹر محمد علی جناح کا یہ خطبہ صدارت پنڈت جواہر لال کی "مسلم ماس کنٹکٹ" کا موثر جواب اور کانگریس کو کھلا ہوا چیلنج تھا جس نے کانگریسی حلقوں میں ہلچل مچادی۔ آج تک کانگریس اور کانگریسیوں پر کسی جماعت کی طرف سے ایسی صاف اور سخت تنقید نہیں ہوئی تھی جیسی اس سال لیگ کے پلیٹ فارم سے ہوئی، اور گفتگو چونکہ اس میں بالکل حقیقت پر مبنی تھی اس لیئے اس کا اثر بھی ہندوستان کی دوسری اقلیتوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً بہت زیادہ ہوا۔

کانگریس کی مسلم ماس کنٹکٹ کی تحریک تو اس خطبہ کے بعد بالکل ہی بے اثر ہو کر رہ گئی تھی اب خود کانگریس کی پوزیشن بھی عوام کی نظروں میں مشتبہ ہونی شروع ہو گئی مسلم لیگ کی طاقت، کا ملک کی طرف سے یہ پہلا اعتراف تھا۔

بائیسواں باب

"قومیت متحدہ" کا نظریہ

کانگرس مسلم ماس کنٹکٹ کے بنیاد دراصل اس نظریہ پہ تھی کہ "قوموں کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے نہ کہ مذہب و نسل سے" ———— یعنی ہندوستان جن قوموں کا وطن ہے، مذہب و نسل کے اعتبار سے وہ چاہے دوسرے سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ ہوں، بہرحال ہندوستانی کہلائینگی اور یہی ہم وطنی ان کی متحدہ قومیت پر سند ہوگی!

اس نظریہ کے علمبرداروں میں آزاد خیال کانگرسی مسلمانوں کے علاوہ (جن میں ڈاکٹر سید محمود اور ڈاکٹر محمد اشرف قابل ذکر ہیں) جمعیۃ العلماء کے مشہور رہنما اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد بھی نظر آئے۔ کانگرس نے ان مذہبی اور غیر مذہبی مسلمانوں کے افکار و آرا کو بڑے سلیقہ سے اپنا "مال تجارت" بنایا اور نوخیز مسلم دماغوں میں ایک ہلچل مچادی۔ لیکن ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم اس نوبت پہ درمیان میں آگئے اور مسلمانوں میں اس دماغی بحران کو بڑھنے سے روک دیا۔ مولانا حسین احمد کو چشم نمائی کرتے ہوئے، ڈاکٹر اقبال نے قومیت اور وطنیت کا اسلامی فلسفہ جس انداز سے بیان کیا اس نے فی الحقیقت کانگرسی

سحر کو باطل کر دیا اور عام مسلمانوں کو ایک ناگوار مخمصے سے نجات دلا دی۔

⁂

نہ معلوم ان آزاد خیال کانگریسی مسلمان اور کانگریسی مولویوں کے پاس اس نظریہ کے لئے سند جواز کیا ہے ؟ نہ یہ قدیم ہے، نہ جدید، نہ یہ مشرقی ہے نہ مغربی نہ سٹفک ہے نہ مذہبی ! ــــــ قومیت کا قدیم تخیل "نسلی" تھا جیسے مغل، آرین، سامی" گاتھک، سکسن وغیرہ۔ زمانہ وسطیٰ میں قومیت کا تخیل "مذہبی" ہو گیا جیسے یہودی، نصرانی، ہندو، بدھ، زردشتی، مسلمان وغیرہ اس کے بعد پھر قومیت کی تقسیم "نسلی" اعتبار ہی سے ہونے لگی چنانچہ اس کی تصدیق ۱۹۱۸ء کے بعد یورپ میں چھوٹی بڑی قوموں کی تقسیم اور "نسلی" اعتبار سے نئی نئی حکومتوں کے قیام سے ہو سکتی ہے۔

جنگ عظیم سے پہلے دُنیا، چکس، اسلوویکس، کروٹس، سروس، سلوس وغیرہ قوموں کے نام تک سے واقف نہ تھی لیکن جنگ عظیم کے بعد جب یورپ کی ہر قوم کا اپنا ایک مستقل وجود تسلیم کر لیا گیا تو یہ ساری گمنام قومیں سطح پر ابھر آئیں اور ان علاقوں کے جن میں یہ پھیلی ہوئی تھیں اور جو ان کے وطن ہو چکے تھے ٹکڑے اڑا دئے اور علحدہ علحدہ اپنی حکومتیں قائم کر ڈالیں۔

جرمنی کو دیکھئے۔ مدت سے یہ "سامیوں" کا بھی اسی طرح وطن تھا جس طرح آرین کا تھا لیکن ہٹلر کے عروج کے ساتھ ہی "جرمن وطنیت" کا نظریہ بدل گیا "سامی" چھانٹ چھانٹ کر جرمنی سے نکال دئے گئے یا "غلام" بنا لئے گئے اور جرمن قومیت صرف آرین نسل پہ محدود ہو کر رہ گئی ! ــــــ وطنیت کے متعلق یہی نظریہ اٹلی کا ہے اور یہی ترکی اور جاپان کا ہے !!۔

البتہ روس میں قومیت اور وطنیت کا تخیل اس سے مختلف ہے۔ متعدد نسلوں اور قوموں کے مجموعہ کا نام "متحدہ سوشل سویٹ روس" ہے ــــــ

——— لیکن یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ متعدد نسلیں اور قومیں جو روس میں شامل ہیں ان سب کی انفرادیت کی بقا اور روایات قومی کے تحفظ کی پوری پوری ضمانت کی گئی ہے۔ ان کی اپنی علحدہ علحدہ حکومتیں بھی قائم ہیں اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے انہیں پورے پورے اختیارات بھی حاصل ہیں۔ گویا یہ قومیں اپنے اندرونی معاملات میں پوری طرح آزاد ہیں۔ پابند صرف اصول حکومت میں ہیں۔ ان سب چھوٹی چھوٹی "سوویٹ" یا حکمراں کونسلوں کا "یونین آف سوشلسٹ سوویٹ ریپلکس" کے نام سے ایک وفاق قائم کیا گیا ہے جس کا طرز حکومت "بالشویک" ہے۔ اس طرح بالشویکس جو روس کے باہر ایک قوم سمجھے جاتے ہیں وہ فی الحقیقت مختلف آزاد اقوام کا مجموعہ ہیں مگر سیاسی مسلک کے اعتبار سے ایک ہی رشتہ میں منسلک ہیں۔

رہے ڈیموکریٹک ممالک، انگلستان، فرانس، اور امریکہ ان میں بیشک وطنیت اور قومیت کا نہایت وسیع تخیل پایا جاتا ہے جو مذہب و عقیدہ کی قید سے یکسر آزاد ہے لیکن یہ ان ممالک کے صدیوں کے ریاض کا حاصل ہے ——— ایک تمدن ایک کلچر، ایک زبان۔ اور فکر و خیال کی یکسانیت نے دراصل انہیں مذہب و عقیدہ اور روایات و توہمات قدیم کی بندشوں سے آزاد کرادیا اور یہی فی الحقیقت "قومیت متحدہ"[1] کی بنیادی خصوصیات ہیں۔

---

[1] ہم نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے اپنی کتاب "عہد حاضر کے بڑے لوگ" حصہ اول صفحہ ۲۷ پر لکھا ہے "متحدہ قومیت کا نظریہ دراصل مشترک تمدن اور کلچر اور روایات قدیم کے اشتراک سے عبارت ہے بلکہ فی الحقیقت انہی اجزا کی موزوں ترکیب کا دوسرا نام "قومیت متحدہ" ہے اور ہندوستان میں یہ صورت ہے کہ یہاں کی چھوٹی بڑی قومیں صدیوں سے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو آباد ہیں لیکن ان کا تمدن ان کا کلچر اور ان کی قدیم روایات

(بقایا صفحہ ۱۸۹)

لیکن رنگ اور نسل کا امتیاز ان ممالک میں آج بھی بدستور باقی ہے، کلچر اور زبان کی یکسانیت اور صدیوں کے مسلسل ریاض کے بعد بھی یہ تعصب دور نہ ہوسکا۔ اس کو چاہے ان کے تمدن کی خامی کہیئے یا ان کے کلچر کا نقص مگر ہے یہ کمزوری جس کے باعث ان کی قومیت متحدہ کا نظریہ اپنی غیر محدود وسعتوں کے باوجود نامکمل سا نظر آتا ہے۔

گویا ڈیموکریٹک ممالک کا فلسفہ قومیت اور وطنیت بھی جس کی بنیاد کلچر پر رکھی گئی ہے اور جو مذہب اور عقیدے کی بندشوں سے بالکل آزاد ہے رنگ اور نسل کے امتیاز کو مٹانے میں قطعاً بے اثر ہے اور اسی لئے ان اقوام کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتا جن کا فلسفہ قومیت اس سے

میں آج تک کوئی مناسبت قائم نہیں ہوئی بلکہ بعض حیثیتوں میں وہ ایک دوسرے سے قطعاً مختلف اور متضاد ہیں۔ اس بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ قومیت متحدہ کا وہ نظریہ جس پہ اکثریت والی قوم کے تمدن اور کلچر کا پورا پورا اثر ہے۔ اپنے اندر ہندوستان کی دوسری قوموں کے لئے جاذبیت نہیں رکھتا اسی وجہ سے مقصد مشترک کی خاطر بھی ہندوستان کی مختلف قوموں میں اتحاد نہ ہوسکا۔

یہ قاعدہ ہے کہ جس ملک میں بڑی چھوٹی کئی قومیں آباد ہوتی ہیں وہاں مفاد مشترک کی خاطر "دے اور لے" کے اصول پر متحدہ قومیت کا ایک ایسا نظریہ مرتب ہو جاتا ہے جو اس ملک کی سب قوموں کو مطمئن کر سکے لیکن ہندوستان میں بدقسمتی سے اس اصول سے اب تک کام نہیں لیا جاسکا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان کی وہ قوم جسکو اتفاق سے اکثریت حاصل ہے سرے سے ہندوستان کی دوسری قوموں کا اپنے سے علحدہ سیاسی اور کلچرل وجود ہی تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ اس کو اکثریت کا تھڑ دلا پن کہیئے یا سیاسی چالبازی لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس تھڑ دلے پن کے باعث قومیت متحدہ کا موجودہ نظریہ جو فی الحقیقت اکثریت والی قوم کا اپنا مخصوص تخیل ہے ہندوستانی اقلیتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔" (مولف)

زیادہ مکمل اور اسی نسبت سے بہتر و برتر سمجھا جاتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی بنیاد کن اصولوں پر ڈالی جاسکتی ہے یہ نظریہ کہ قوموں کی تشکیل اوطان سے ہوتی ہے، اپنی صحت پر کوئی سند نہ لاسکا البتہ اس کا ثبوت ہمیں مل گیا کہ مذہب وعقیدے کی بندشوں سے آزاد ہوکر تمدن اور کلچر کی ہموار بنیادوں پر قومیت متحدہ کی تعمیر ہوسکتی ہے لیکن ہندوستان کی مختلف قوموں کے تمدن اور کلچر میں چونکہ بنیادی اختلافات پائے جاتے ہیں اور ان میں اشتراک باہمی کی کوئی راہ نہیں نکالی جاسکتی اس لئے یہ اصول بھی ہندوستان میں ایک متحدہ قومیت کی تشکیل میں مدد نہیں دے سکتا۔ اگرچہ آزاد خیال کانگرسی حضرات ان بنیادی اختلافات کو تسلیم نہیں کرتے جو ہندوستان کی بسنے والی مختلف قوموں کے تمدن اور کلچر میں پایا جاتا ہے بلکہ ان کو وہ فرضی اور خیالی اختلافات سے تعبیر کرتے ہیں اور اس پہ مصر ہیں کہ "متحدہ قومیت" کی خاطر ان ظاہری اختلافات کو مٹادیا جائے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے جسے بڑی سے بڑی آزاد خیالی بھی محو نہیں کرسکتی کہ ہندوستان ہزاروں برس سے مختلف قوموں کا گہوارہ رہا ہے اور یہ قومیں یہاں اس طرح سے آباد ہیں کہ باوجود آپس میں معاشی اور معاشرتی تعاون کے ان کا قومی وجود اور مخصوص کلچر اب تک محفوظ چلا آتا ہے چنانچہ آج بھی شمالی ہندوستان کا کلچر جنوبی ہندوستان سے اور مشرقی ہندوستان کا کلچر مغربی ہندوستان سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے اور قطع نظر ان مذہبی اختلافات کے جو ایک قوم کہلانے کے باوجود ہندوؤں میں پائے جاتے ہیں ہندوؤں کے مختلف طبقات میں بھی وہ معاشرتی ربط واتحاد اور کلچرل یگانگت

نظر نہیں آتی جو ایک قوم کہلانے کے لئے لابدی ہے!

یہ تو ہندوستان کی صرف ایک قوم کا حال ہوا دوسری قوموں میں مسلمان، عیسائی، اور حد یہ ہے کہ پارسی تک جو صدیوں سے ہندوستان کی کروڑوں کی آبادی میں صرف چند لاکھ کی تعداد میں بستے ہیں ایک مخصوص کلچر کے مالک ہیں اور انتہائی اہتمام اور عصبیت کے ساتھ اس کی محافظت کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن ہیں کہ سارے ہندوستان میں کلچرل یگانگت اور مساوات پیدا ہو جائے!۔

"یہ کلچر کیا بلا ہے؟ اور مختلف قوموں میں جو کلچرل اختلافات پائے جاتے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے؟" ——— آزاد خیال کانگرسی حضرات کی طرف سے طنزاً یہ سوال کئے جاتے ہیں۔ اور یہ سمجھ کر کئے جاتے ہیں کہ مذہبی اور رواجی طرز معاشرت سے ہٹ کر کلچر کی صحیح تعریف ہو سکتی ہے اور نہ ظاہری نقوش کو نظر انداز کر کے کلچرل اختلافات کو صحیح طور پر متعین کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ان کی غلط فہمی ہے محض رسم و رواج، آداب و روایات اور طرز معاشرت کا نام کلچر نہیں ہے بلکہ چند ٹھوس اور بنیادی اصولوں کے ماتحت ایک خاص ماحول میں ذہنی اور دماغی تربیت کا نام "کلچر" ہے اور کلچرل اختلافات کی نوعیت انہی بنیادی اصولوں کی تنقیح اور اس خاص ماحول کا جائزہ لینے کے بعد متعین کی جا سکتی ہے جس ماحول میں کلچر نشو و نما پاتا ہے۔

یہاں اس کا موقع نہیں ہے کہ ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم کے کلچرل مسلمات کا بالتفصیل جائزہ لیا جاسکے البتہ اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ خود ہندوؤں کے متعدد طبقوں میں باوجود ایک قوم کہلانے کے یہی بنیادی

اصول اور یہی خاص ماحول ہے جو آپس میں معاشرتی ربط و اتحاد اور کلچرل یگانگت نہیں پیدا ہونے دیتا اور یہی ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوؤں اور عیسائیوں، اور ہندوؤں پارسیوں میں باعث اختلاف ہے۔" کیا ان قوموں کے کلچرل اختلافات دور کئے جا سکتے ہیں؟ ——— کانگریسی مسلمانوں اور کانگریسی مولویوں کا تو ایمان یہی ہے کہ ایسا ہو سکتا ہے! لیکن فی الحقیقت ان اختلافات کا دور ہونا ممکن ہی نہیں اس لئے کہ یہ اختلافات جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے بنیادی ہیں سطحی نہیں ہیں ان کا تعلق قوموں کی جبلتوں سے ہے رسم و رواج سے نہیں ہے مزاجوں کی ترکیب اور ذہنی کیفیتوں سے ہے آداب و معاشرت سے نہیں ہے عقیدے اور یقین سے ہے ظاہری تراش خراش یا طرز رہائش سے نہیں ہے۔ اگر یہ اختلافات محض فرضی اور خیالی ہوتے جیسا کہ بعض کانگریسی مسلمانوں کا خیال ہے تو ہزاروں برس بعد بھی ہندوؤں میں کلچر کی یہ ناہمواری نظر نہ آتی اور نہ صدیوں کی یکجائی کے بعد ہندوستان کی دوسری قومیں اپنی کلچرل خصوصیات کو محفوظ رکھ سکتیں۔ جب اتنی مدت کی ہم نشینی سے بھی یہ اختلافات محو نہ ہو سکے تو اب انہیں باتوں سے نہیں مٹایا جا سکتا! ——— حقائق کو حقیقت ہی کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے ان کو نظری یا خیالی فرض کر لینا ستم ظریفی ہے!

عیسائیوں اور پارسیوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ اپنی قومی خصوصیات سے

ع۵ برہمن اور شودر کے ماحول کا فرق اسقدر نمایاں ہے کہ اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں اسی طرح ویش اور چھتری سکھ اور سندھی بدھ اور جینی، آریہ اور سناتن دھرمی وغیرہ وغیرہ قوموں نے اپنا مخصوص ماحول تیار کر لیا ہے جس کے باعث ان میں آپس میں اتحاد فکر و خیال مفقود ہے (مولف)

دست بردار ہو جائیں؟ مسلمانوں کو کس لئے یہ تلقین کی جارہی ہے کہ وہ اپنا کلچر بھول جائیں؟ ——— اسلام مسلمانوں کا مذہب بھی ہے اور کلچر بھی ہے ایسا مکمل کلچر جس میں رنگ ونسل کی کوئی قید نہیں کالے گورے، حبشی اور ولایتی کا کوئی امتیاز نہیں۔ رسم ورواج اور آداب معاشرت کی کوئی پابندی نہیں ——— اسدرجہ مکمل کلچر کو چھوڑ کر مسلمان اس ادھورے کلچر کا کیوں تتبع کریں جس میں صدیوں کی صفائی کے بعد آج بھی "رنگ ونسل" کے جراثیم موجود ہیں؟

"مشترک کلچر"؟ ——— ضدیں کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں مزاجوں کے اختلافات اور متضاد ذہنی کیفیتوں کو ایک سطح پر نہیں لایا جاسکتا!

اپنی قومی خصوصیات سے دست برداری کے معنی اپنی انفرادیت کو مٹا دینا ہے ایسی مکمل انفرادیت کو مٹا دینے کی تلقین جو ایک عظیم الشان تمدن اور رفیع المرتبت کلچر کی وارث ہو، ہذیان ہے جس پر ایک لمحہ کے لئے بھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا جاسکتا!

⁂

"متحدہ قومیت" کے سلسلہ میں اس پریشان خیالی اور کج دماغی کا باعث دراصل یہ مفروضہ ہے کہ ہندوستان ایک "ملک" ہے اور اس ملک کی بسنے والی ساری قومیں ایک رشتۂ وطنیت میں منسلک ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کی حیثیت ہمیشہ سے ایک "براعظم" کی سی ہے جس میں مختلف نسلیں۔ اور قومیں شمال سے آکر اس کے مختلف حصوں میں آباد ہوتی گئیں اور جس گوشہ میں یہ پھیل پڑیں اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں ہندوستان پر ایک سے زیادہ قوموں کی آزاد حکومتیں قائم رہیں اور جب کبھی

کوئی بادشاہ ہندوستان کی کئی حکومتوں کو اپنے زیر نگیں بنانے میں کامیاب ہوا اس نے "شہنشاہ" کا لقب پایا۔ یہی صورت آج ہے بعض علاقے براہ راست شہنشاہ کے زیر نگیں ہیں اور بعض علاقوں پر ہندوستان کی دو بڑی قوموں کے متعدد "بادشاہ" حکمران ہیں جو شہنشاہ کے وفادار اور باج گذار ہیں۔

اگر کانگرس اس حقیقت سے چشم پوشی نہ کرتی اور یہ تسلیم کر لیتی کہ ہندوستان ایک ملک نہیں ایک براعظم ہے جس میں مختلف قومیں اپنی قومی اور نسلی خصوصیات کے ساتھ آباد ہیں تو "قومیت متحدہ" کا مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو سکتا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ جس قوم نے جس گوشہ ملک کو اپنا وطن بنا لیا ہے وہاں اس کی آزاد حکومت تسلیم کر لی جائے اور ان سب چھوٹی چھوٹی حکومتوں کا مرکز میں ایک وفاق قائم کر دیا جائے تاکہ یہ انفرادی طور پر آزاد لیکن مشترک مفاد میں متحد رہیں۔ طرز حکومت البتہ آپس کے مشورے سے طے ہو سکتا ہے۔ اس طرح کا جو وفاق تیار ہوتا وہ ملک کے سیاسی اغراض و مقاصد کے ماتحت "متحدہ قومیت" کا نہایت صحیح مرقع ہوتا جس میں ہندو مسلم اختلافات کی مطلق گنجائش نہ ہوتی۔ اور یہ صورت بالکل اجنبی بھی نہیں ہے روس اور امریکہ کی طرز حکومت کا یہ ملا جلا خاکہ ہے۔ جو حالات کے لحاظ سے ہندوستان پر پوری طرح چسپاں ہے۔ لیکن کانگرس کے آزاد خیال حضرات کو یہ صورت پسند نہ آئی اور چونکہ خود انہوں نے اس مسئلہ کا کوئی ایسا مناسب حل پیش نہیں کیا جو اوروں کو مطمئن کر سکتا اس لئے "قومیت متحدہ" سیاسیات حاضرہ کی ایک ایسی مہمل اصطلاح بن کر رہ گئی جو شرمندہ معنی نہیں!

ہ ہ ہ

تیئسواں باب

کانگرسی وزارتوں کا دور

کانگرس نے ابتداءً چھ صوبوں میں اپنی وزارت بنائی جہاں ان کی اکثریت تھی، اور صوبہ سرحد میں انڈپینڈنٹ ممبروں سے ملکر مخلوط وزارت بنانے میں کامیاب ہوئے اور کچھ دنوں بعد آسام میں بھی انہوں نے اپنی مخلوط وزارت بنالی اس طرح (۱۱) صوبوں میں سے چھ پر کانگرسی اور دو صوبوں میں مخلوط وزارت قائم ہوگئی۔ مخلوط وزارت کی ترتیب کا اصول کانگرس نے صرف ان صوبوں میں جائز رکھا جہاں ان کی اکثریت نہیں تھی لیکن جن صوبوں میں ان کی اکثریت تھی وہاں انہوں نے کسی پارٹی کو اپنی وزارت میں شامل نہیں کیا۔ اب تک ملک نے کانگرس کو ایجی ٹیشن کرنے والی جماعت کی حیثیت سے جانا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ وہ حکمران جماعت کی حیثیت سے ملک کے اسٹیج پر آئی تھی۔ کانگرس نے حکومت سنبھالنے کے بعد نظم و نسق کی ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو صوبوں میں پائی جاتی تھیں اور اپنے اس پروگرام پر بھی عمل شروع کردیا جو کانگرس نے انتخابات کے وقت بنالیا تھا، لیکن حکومت کا چونکہ اس جماعت کو تجربہ نہ تھا اسلئے

اس سے بعض معاملات میں مسلسل لغزشیں ہوئیں۔ اور بعض طبقوں کو اس سے شکایت پیدا ہو گئی۔

مزدوروں کا قضیہ یو پی اور بمبئی کے صوبوں میں ناگوار صورت اختیار کر گیا، مسلسل ہڑتالیں ہوئیں پکٹنگ لگائے گئے فساد ہوئے کانگرس کی حکومتوں نے ان فسادوں کو دور کرنے کے لئے قوانین سے کام لینا شروع کر دیا گویا مزدوروں کی بےچینی کو دور کرنے کے لئے کانگرسی حکومتیں وہی طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں جن طریقوں کے خلاف یہ اب تک احتجاج کرتی رہی تھیں اس کی وجہ سے سوشلسٹوں کو اس حکومت سے شکایت پیدا ہو گئی اور انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ کانگرسی حکومت نے دستور جدید کے نفاذ کو بے اثر بنانے کے لئے وزارتیں قائم نہیں کی ہیں۔ بلکہ دستور کو کامیاب بنانا ان کا مقصود ہے۔ چنانچہ اسی شکایت کے باعث سوشلسٹوں نے کانگرس سے علحدہ ہو کر اپنی تنظیم شروع کر دی۔ اور کانگرس کی صفوں میں پھوٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔

⁂

مزدوروں اور سوشلسٹوں کے علاوہ کانگرسی وزارتوں سے مسلمانوں کو بھی سخت شکایت پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ عام ہندو کانگرس کی حکومت کو "رام راجیہ" سمجھے اور جگہ جگہ انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیکر مسلمانوں پر جبر و تعدی شروع کر دی۔ مختلف مقامات پر شدید فساد ہوئے جن میں مسلمانوں کی جان اور مال کا بڑا نقصان ہوا۔ لیکن کانگرسی حکومت نے ان فسادات کو روکنے کی کوئی موثر تدابیر اختیار نہیں کیں۔ جس کی وجہ سے مسلمان عام طور پر کانگرسی حکومتوں سے بدظن ہونے لگے۔

اصل میں کانگریسی وزارتوں نے حکومت کے نشہ میں سرشار ہوکر بعض ایسی حرکتیں کرنی شروع کردی تھیں جو ایک ذمہ وار حکومت کے شایان شان نہیں کہی جا سکتیں مثلاً کانگریسی حکومتوں کی طرف سے ہر ضلع کے عہدہ داروں کے نام یہ احکام جاری کردیے گئے تھے کہ کانگریس کمیٹیوں کے خلاف کوئی کارروائی نہ کریں سرکاری عمارتوں پر کانگریس کا جھنڈا لہرائیں اور مقامی انتظام میں ضلع اور صوبہ کانگریس کمیٹیوں سے مشورے لیا کریں۔ اسی کے ساتھ ان حکومتوں نے اپنے صوبے کی کونسلوں اور اپنے علاقے کے اسکولوں میں "بندے ماترم" گانے کا حکم دیدیا اور اسے قومی ترانہ قرار دیا۔ اسکولوں کے نصاب بدل دیے اور ایسی قابل اعتراض کتابیں نصاب میں داخل کردیں جن سے ہندو مسلم تعلقات خراب ہوتے تھے۔ ان احکامات کا قدرتی طور پر یہ اثر ہوا کہ ہندوؤں کو شہ ملی اور مسلمانوں کو یہ یقین ہوگیا کہ کانگریس کی حکومت فی الحقیقت ہندو حکومت ہے جس میں مسلمانوں کا مذہب تمدن اور معاشرت محفوظ نہیں رہ سکتا۔

ان احکامات کے ساتھ ساتھ کانگریسی حکومتوں نے اردو زبان کی پامالی اور ہندی کے پرچار کا فرض بھی اپنے ذمہ لے لیا، ساہتیہ سمیلن نے ملک کے مختلف مقامات پر جلسے کیے اور اپنے علاقے کے ہر اسکول میں ہندی کی تعلیم کو لازمی قرار دیدیا۔ بلکہ ہندی کے پرچار میں اس قدر غلو کیا کہ مدراس جیسے صوبے میں جہاں کی زبان "تامل" ہے ہندی زبان کو لازمی قرار دے دیا اسی کے ساتھ حکومت کے ہر شعبہ میں ہندی زبان کو قومی زبان کی حیثیت سے داخل کردیا اور اس طرح مسلمانوں کو جو

ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو بولتے ہیں مجبور کرنا شروع کر دیا کہ وہ ہندی سیکھیں۔

ہندوستان کی مشترکہ زبان کے ساتھ یہ سلوک روا رکھنے کی سب سے بڑی دلیل کانگرسی ہندؤں کے پاس یہ تھی کہ اردو "قرآنی حروف" میں لکھی جاتی ہے اور مسلمانوں کی مخصوص مذہبی زبان ہے، حالانکہ یہ مسلمانوں پر اتہام تھا، اُردو کو کبھی مسلمانوں کی مذہبی زبان بننے کا شرف حاصل نہیں ہوا اور نہ یہ خالص مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ یہ ہندؤں اور مسلمانوں دونوں کی مشترک زبان ہے اور انہی دونوں کے اتحاد سے یہ عالم وجود میں آئی ہے۔ رہا یہ الزام کہ اس کا رسم الخط قرآنی ہے اردو کی طرز تحریر سے ناواقفیت کی علامت ہے۔ اُردو کا رسم الخط عربی نہیں ہے (جو مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے) فارسی ہے اور فارسی زبان کو مسلمانوں کے مذہب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ لیکن اگر اس دور دراز کی مشابہت کے باعث کانگریس یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوسکتی ہے کہ اُردو "قرآنی حروف" میں لکھی جاتی ہے اسی لئے ہندو اُسے قبول نہیں کر سکتے تو سوال یہ ہے کہ مسلمان اس زبان کو کیوں قبول کریں اور کس لئے اس کے سیکھنے پہ مجبور کئے جائیں جو زبان "شاستروں کے حروف" میں لکھی جاتی ہے؟ اُردو اور عربی میں اتنی مشابہت بھی نہیں ہے جتنی ہندی اور سنسکرت میں ہے۔ بلکہ ہندی کا رسم الخط وہی ہے جو سنسکرت کا ہے یعنی اس زبان کا جو ہندؤں کی مذہبی زبان کہلاتی ہے پھر یہ کیا انصاف ہے کہ اُردو کو یہ کہکر رد کر دیا جائے کہ یہ ایک فرقہ کی مذہبی زبان سے مشابہت رکھتی ہے اور ہندی کو شاستروں کی زبان سے

گہری مشابہت کے باوجود (جن کا تعلق ظاہر ہے کہ ہندوستان کے محض ایک فرقہ سے ہے) چپ چاپ قبول کر لیا جائے بلکہ یہ دعوے کیا جائے کہ ہندی سارے ہندوستان کی قومی زبان ہے؟-

قوت پرستی کے پردے میں کانگرسی ہندوؤں کی اسی انتہا سے زیادہ گندی اور پایہ سقاہت سے گری ہوئی ذہنیت نے مسلمانوں کو مشتعل کرنا شروع کیا اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ قومی حکومت کے نام سے ہندو صرف اپنی حکومت قائم کرنی چاہتے ہیں جس میں مسلمانوں کے وجود کے اعتراف تک کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے-

؞

کانگرسیوں کی ان حرکتوں پر مجبوراً مسلم لیگ کو جو مسلمانوں کی اکثریت کی جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے، احتساب کرنا پڑا۔ مسلم پریس اور مسلم پلیٹ فارم سے کانگرس کے اندر کے تعصب کے خلاف نہایت سختی سے احتجاج کیا گیا اور کانگرس پر کھلم کھلا فرقہ پرستی کا الزام لگا کر اسے چیلنج دیا گیا کہ ملک کے آگے اپنی پوزیشن صاف کرے یہ پہلا اتفاق تھا کہ کانگرس کو اس قدر سختی سے اور صاف لفظوں میں فرقہ پرستی کا ملزم ٹھہرایا گیا تھا۔ کانگرس اس سے چراغ پا ہو گئی اور کانگرسی پریس اور پلیٹ فارم نے متحد ہو کر اس الزام کی تردید میں نہیں بلکہ مسلم لیگ کی انگریز دوستی کا پروپگنڈا شروع کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس ہڑبونگ میں کانگرس پر فرقہ پرستی کا جو الزام لگایا گیا ہے اسے لوگ بھول جائیں اور الٹے الزام لگانے والے پر لعنت ملامت کی بوچھار کرنے لگیں۔ یہ نفسیاتی حملہ تھا، جس میں سنجیدگی کے ساتھ مسلم لیگ کے

الزامات کا جواب دینے کے بجائے عوام کے جذبات سے اپیل کی گئی تھی دلائل کی قوت کو پبلک کے ہیجان سے توڑنا چاہا تھا، اور حقائق اور واقعات کی پردہ پوشی پبلک کے اشتعال سے کرنی چاہی تھی!

لیکن مسلمانوں میں اب بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ان کی اکثریت نے زندہ رہنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ اس ناپاک پروپگنڈے کا مسلمانوں کی اکثریت پر وہ اثر نہ ہو سکا جو کانگریس اور کانگریس کے حمایتی مولوی پیدا کرنے چاہتے تھے اور کانگریس کو مسلم لیگ کے چیلنج سے بچنے کے لئے کوئی سنجیدہ تدبیر اختیار کرنی پڑی۔

***

پچھلے باب میں آپ پڑھ چکے ہیں اسمبلی میں وزیر اعظم کے فرقہ وار فیصلہ پر مسٹر جناح کی تقریر کے بعد بابو راجندر پرشاد اور مسٹر جناح کے درمیان فرقہ وار فیصلہ کا نعم البدل تلاش کرنے کے سلسلہ میں گفتگو شروع ہوئی تھی لیکن یہ گفتگو مہا سبھائیوں اور بنگالیوں کی شدید مخالفت کے باعث کامیاب نہ ہو سکی تھی اسی کوشش کو وجہ "تخریب" بنا کر ایک طرف گاندھی جی نے اور دوسری طرف پنڈت جواہر لال نے مسٹر جناح سے خط کتابت شروع کی۔ پنڈت جی نے بڑے لمبے لمبے خط لکھے۔ خوب شکایتوں کے دفتر کھولے۔ آپس کی رنجشوں کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ لیکن اپنی تحریرات میں یہ احتیاط برتی کہ مسلمانوں کی اصلی شکایتوں کے متعلق کہیں کوئی اشارہ بھی نہ آنے پائے۔ مسٹر جناح نے پنڈت جی کو ٹوکا کہ ان غیر متعلق بیانوں سے آپ کا منشا کیا ہے کانگریس آخر مسلم لیگ سے چاہتی کیا ہے جس کی اتنی لمبی تمہید اٹھائی ہے۔ پنڈت جی نے نہایت

بھو۔ لے پن سے لکھا کہ کانگرس یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ مسلمانوں کو اُس سے کیا شکایت ہے ؟ اللہ ری بے خبری ! اللہ ری بے نیازی ! یعنی پنڈت جی کو اس ساری مدت میں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ مسلمانوں کو کانگرس سے کیا شکایت پیدا ہو گئی ! گویا کانگرس کے نقار خانہ میں مسلم طوطی کی آواز ہی نہیں پہونچ سکتی ! اور پنڈت جی جیسے باخبر کانگرسی لیڈر تک کو یہ علم نہ ہو سکا کہ کانگریس کی فرقہ وارانہ حرکتوں کا مسلمانوں پر کیا ردعمل ہوا ہے ؟ !

بہرحال پنڈت جی کا یہ تجاہل بھی دور کیا گیا اور لکھا گیا کہ اگر آپ مسلمانوں کی ان شکایتوں کو دور کرنا چاہیں تو مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کر کے اس سلسلہ میں اس سے گفتگو کر سکتے ہیں۔ مسلم لیگ کے اس دعوے سے کانگرس پنڈت جی دونوں چکرائے ۔ اس لئے کہ اگر مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لیا جائے تو کانگرس کی پوزیشن کیا باقی رہ جاتی اور کانگرس کے ان چند وفاداروں کا شمار پھر کس قطار میں ہوتا جو اپنی قوم کی اکثریت سے علحدہ ہو کر کانگرس کی دہلیز پر آپڑے ہیں ؟

ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کا یہ دعوے تسلیم کر کے کانگرس اپنے دعوے نمائندگی کی خود ہی تغلیط نہیں کر سکتی تھی، اس لئے معاملہ یہیں رک گیا اور خط کتابت بند ہو گئی۔ کچھ دنوں بعد سبھاش چندر بوس نے مسٹر جناح سے اسی معاملہ پر گفتگو کرنی چاہی آپس میں خط کتابت بھی ہوئی، ملاقاتیں بھی ہوئیں، بعض مسائل پر تبادلہ خیال بھی ہوا لیکن جیسے ہی لیگ کی نمائندہ حیثیت تسلیم کرنے کا سوال ہوا تو یہ کوشش بھی پہلے کی طرح بے نتیجہ ختم ہو گئی۔

...

مسلم لیگ کے ساتھ کانگرس کے اس طرز عمل کا ایک ہی جواب ہو سکتا تھا

اور وہ یہ کہ مسلمانوں کو نہایت تیزی اور سرگرمی سے منظم کیا جائے اور کانگرس اور حکومت دونوں سے ان کی قوت کا لوہا منوا لیا جائے۔ چنانچہ لیگ کے رہنماؤں نے مسلمانوں کی تنظیم کا کام اور زیادہ تیزی سے شروع کر دیا۔ ہر شہر اور قصبہ میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کیں جلسے ہونے لگے جلوس نکلنے لگے "اسلامی پرچم" کی نقاب کشائی کی رسمیں ادا ہونے لگیں غرض ان سرگرمیوں سے عام مسلمانوں میں اپنی زندگی کا نیا احساس پیدا کیا جانے لگا۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں کلکتہ میں مسلم لیگ کا خاص اجلاس مسٹر محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا جس میں مسٹر جناح نے ملک کی سیاسی صورت حال پر نہایت پُر مغز خطبہ دیا۔ لیگ کی گذشتہ کارگذاریوں اور عام مسلمانوں میں لیگ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت پر روشنی ڈالی اور آخر میں اعلان کیا:۔

"بعض کانگرسی صوبوں میں جو مسلمانوں پر طرح طرح کی پابندیاں عاید کی جارہی ہیں اور ان کے ساتھ نہایت ناروا سلوک کیا جارہا ہے اور ہر معاملہ میں ان سے بے انصافی کی جارہی ہے اس کی بے انتہا شکایتیں کانگرس کی صوبائی حکومتوں کے خلاف مسلم لیگ کے دفتر میں وصول ہوئی ہیں ان کی باقاعدہ تحقیقات کر کے لیگ کونسل میں رپورٹ پیش کرنے کے لئے راجہ محمد مہدی صاحب آف پیر پور کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جو فوراً اپنا کام شروع کردے گی۔"

مسٹر جناح کے اس اعلان کے بعد لیگ اور کانگرس میں گویا ٹھن گئی اور کانگرس کو یہ احساس ہونے لگا کہ مسلم لیگ ہندوستان کی سیاست میں اس کی نہایت طاقتور رقیب ثابت ہوگی اور اس کی موجودگی میں کانگرس

کو اپنے منصوبوں میں کامیاب ہونا مشکل ہو جائیگا۔

⁂

۲۴ چوبیسواں باب

ایشیار کی اسلامی حکومتوں سے مسلم لیگ کی دلچسپی

اعلان بالفور کے بعد سے فلسطین کے عربوں اور یہودیوں میں مستقل رنجش تو پیدا ہو ہی گئی تھی ہجرت اور زمینوں کی ملکیت کے معاملہ میں اور زیادہ بدمزگی بڑھ گئی۔ عرب ابتداءً احتجاجی مظاہروں کے ذریعہ برابر اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے رہے لیکن جب حکومت میں کسی طرح خبر ہی نہ ہوئی تو عربوں کے ایک پرجوش گروہ نے فلسطین میں مسلح ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ یہ ایجی ٹیشن نہایت منظم طریقہ پر شروع ہوا گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ ایجی ٹیٹروں نے اپنے مورچے لگا دئے اور حکومت برطانیہ کے نمائندوں اور یہودیوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس ایجی ٹیشن کے زور کو توڑنے اور صورت حال پر قابو پانے کے لئے حکومت برطانیہ کو برطانوی فوجیں انگلستان سے بھیجنی پڑیں، جنہوں نے انتہائی تشدد سے کام لیکر ہزاروں عربوں کو بے خانماں اور سیکڑوں کو بے پرسش کے پھانسی پر لٹکا دیا اور ان کے گاؤں کے گاؤں تباہ کر ڈالے ایک طرف یہ ہنگامہ جاری تھا دوسری طرف حکومت برطانیہ نے لندن میں عربوں اور یہودیوں کی ایک کانفرنس طلب کی تاکہ فلسطین کی

پالیسی پر نظر ثانی کرے اور عربوں اور یہودیوں کے قضیہ کو طے کرا دے۔

۱۹۳۸ء کے وسط میں فلسطین کی یہ صورت حال تھی جس پر عراق، عرب اور مصر کی حکومتوں نے برطانیہ کو متوجہ کیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ فلسطین کی یہودنواز پالیسی پر نظر ثانی کرے اور بے گناہ عربوں کے خون سے فلسطین کی سرزمین کو لالہ زار نہ بنائے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے ان حالات پر مسلم لیگ نے صدائے احتجاج بلند کی جولائی ۱۹۳۸ء میں نئی دلی میں لیگ کونسل کا ایک اجلاس ہوا جس میں فلسطین کے حالات پر نہایت پُر جوش تقریریں کی گئیں اور حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ فلسطین کے عربوں کو خود ان کے وطن میں ذلیل و خوار رکھنے کی ناپاک پالیسی سے باز آجائے اور اعلان بالفور کو منسوخ کر کے اس ناگوار قضیہ کو ختم کر دے جو اس نابکار اعلان کے بعد سے عربوں اور یہودیوں کے درمیان پیدا ہو گیا ہے۔ اسی کے ساتھ مسلم لیگ نے قاہرہ میں عالم اسلام کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لئے جو فلسطین کے حالات پر غور کرنے کے لئے حکومت مصر کی طرف سے بلائی گئی تھی اپنے پانچ نمائندے بھی نامزد کئے اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ اپنے نمائندے فلسطین اور انگلستان بھی بھیجے گی تاکہ وہاں کے حالات کا وہ بچشم خود مطالعہ کریں اور انگلستان جا کر برطانوی پارلیمنٹ کے ممبروں کے آگے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطۂ خیال کی ترجمانی کریں۔

∴

مسلم لیگ نے، فلسطین میں برطانوی پالیسی کے خلاف، ہندوستانی مسلمانوں کے احتجاج کو موثر بنانے کے لئے ۲۶ راگست کو یوم فلسطین منانے کا بھی اعلان کیا تھا جو نہایت کامیابی سے ملک کے طول و عرض میں منایا گیا،

احتجاجی مظاہرے کئے گئے جلوس نکلے، جلسے ہوئے اور حکومت پر یہ اچھی طرح واضح کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان برطانیہ کی مسلم آزار پالیسی کو کس نظر سے دیکھتے ہیں!
اکتوبر ۱۹۳۸ء میں سندھ مسلم لیگ کانفرس (کراچی) کے موقع پر مسٹر جناح نے اپنے خطبہ صدارت میں فلسطین کے متعلق خصوصاً اور ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق عموماً برطانوی پالیسی پر نہایت سختی سے تنقید کرتے ہوئے فرمایا:۔

"برطانیہ کے مقابلہ میں کامیاب وہی ہوتے رہے ہیں جو طاقتور ہوں اور جو برطانیہ کو ڈرا دھمکا سکیں ———— "میں اس کو سختی کے ساتھ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ایشیا میں اسوقت تک امن قائم نہیں ہوسکیگا جبتک برطانیہ فلسطین کے عربوں سے منصفانہ برتاؤ نہ کرے گی۔

اور ہندوستان کی نسبت حکومت برطانیہ اور سیاسی رہنماؤں پر یہ حقیقت واضح کر دینی ضروری ہے کہ تشدد اور بے انصافیوں کا دور زیادہ دنوں باقی نہیں رہ سکتا۔ "سوڈٹین" جرمنوں کے ہر جائز مطالبہ کو چکوسلاویکیا نے (۲۰۰) برس تک اپنے پیروں کے نیچے روندا انہیں تباہ و برباد کیا ان کے حقوق غصب کئے، اس ظلم و تشدد کا نتیجہ یہ ہوا کہ چکوسلاویکیا کے حصے بخرے ہوگئے۔ اب ایک نیا نقشہ بنے گا جس طرح سوڈٹین جرمن غیر محفوظ نہیں تھے اور مدت تک ظلم و ستم برداشت کرتے رہے اسی طرح ہندوستانی مسلمان بھی غیر محفوظ نہیں ہیں اور نہ وہ اپنی قومی یگانگت اور حوصلوں سے دست بردار

ہو چکے ہیں۔ مسلمان کسی حالت میں کبھی اپنا کلچر اور تمدن نہ مٹنے دیں گے اور نہ ہندوستان کے برّاعظم میں اپنی قومی حیثیت کو کبھی زائل ہونے دینگے۔

اس موقع پر میں حکومت کو اس کی سرحدی پالیسی کے متعلق بھی ٹوکنا چاہتا ہوں اس پالیسی کو وہ جسقدر جلد مصالحت اور مفاہمت میں بدل دے اسی قدر بہتر ہے۔

میں حکومت سے نہایت زور سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ فلسطین وزیرستان، اور ہندوستان کے مسلمانوں کے متعلق خصوصاً اور اسلامی ممالک کے متعلق عموماً اپنی پالیسی پر نظرثانی کرے۔

اور مسلمانوں سے میری درخواست ہے کہ وہ قدم آگے بڑھائیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں اپنے آپ کو پورے طور پر منظم کرلیں۔ اگر منطق اور عملی دلیلوں سے انہیں اپنے مطالبے حاصل کرنے میں کامیابی نہ ہو تو اپنی منظم طاقت پر بھروسہ کریں۔

زندگی اور موت کی اس جنگ عظیم کے نتیجہ سے جس میں نو کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، میں ہرگز مایوس نہیں ہوں اور نہ اس میں مسلمانوں کے لئے کوئی خطرہ ہے"

⁂

پچیسواں باب[۲۵]

فیڈریشن کا مسئلہ اور ریاستوں کے متعلق کانگرس کی روش

پروانشل اٹانمی کی صورت میں دستور جدید کی ایک قسط ملک میں نافذ ہو چکی تھی اور دوسری قسط یعنی "فیڈریشن" کے لئے بہت دنوں سے ملک کو تیار کیا جا رہا تھا۔ لیکن فیڈریشن میں ہندوستان کے بعض طبقوں کے لئے کشش اور دلچسپی کا کوئی سامان نہیں تھا، اس لئے حکومت برطانیہ کی طرف سے مسلسل کوششوں کے باوجود فیڈریشن کا راستہ ہموار نہ ہو سکا۔

والیان ریاست اور ہندوستانی مسلمان فیڈریشن کی موجودہ شکل کو بہ جنسہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے، والیان ریاست کی طرف سے یہ اصرار تھا کہ ان کے قدیم معاہدات کا اعتراف اور روایات و اعزازات قدیم کے تحفظ کی طمانیت کی جائے اور مسلمان یہ چاہتے تھے کہ مرکز کی ذمہ داری میں مسلمانوں کو بھی مناسب حصہ دیا جائے۔ محض ایک قوم کی قطعاً اکثریت قائم کر دینے سے ہندوستان کی دوسری قوموں کے سیاسی مفاد حاصل نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کے علاوہ کانگرس بھی فیڈریشن کی موجودہ صورت میں ترمیم چاہتی تھی۔ لیکن اس مسئلہ میں کانگرس میں دو گروہ ہو گئے تھے ایک

گروہ چاہتا تھا کہ فیڈریشن کو قبول کر لیا جائے اور والیان ریاستوں کو جو اختیار مل چکا ہے کہ وہ اپنے نمائندے خود نامزد کیا کریں اس اختیار کو حکومت برطانیہ کے اثر سے زائل کرنے کے بجائے خود ریاستوں کی رعایا میں احساس بیداری پیدا کر کے اُسے زائل کیا جائے۔ اس لئے کہ جب ریاستوں کی رعایا ایک زبان ہو کر والیان۔ ریاست پہ یہ زور ڈالیگی کہ مرکز میں ریاست کے نمائندے والیان ریاست کی طرف سے نامزد نہیں کئے جائیں گے بلکہ رعایا انہیں منتخب کیا کرے گی تو پھر والیان ریاست اس کا مقابلہ نہ کر سکیں گے اور اس طرح ان اختیارات سے کام نہ لے سکیں گے جو حکومت برطانیہ نے فیڈریشن کی اسکیم میں انہیں عطا کر دیا ہے۔ اس گروہ کی قیادت گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھ میں تھی۔

لیکن کانگرس کا دوسرا گروہ فیڈریشن کو سرے سے قبول کرنے ہی کے خلاف تھا اس گروہ کی یہ رائے تھی کہ اس اسکیم میں ہندوستانیوں کو جو طرز حکومت عطا کیا گیا ہے وہ ان کی توقعات سے بہت کم ہے۔ ہندوستان کی طرز حکومت کا فیصلہ خود ہندوستانیوں پر چھوڑنا چاہیئے کسی اور کو یہ حق نہیں کہ اپنی مرضی سے کوئی اسکیم وہ ہندوستانیوں کے سر تھوپ دے یہ گروہ سوشلسٹ کہلاتا ہے اور سبھاش اور جئیند ربوس اور ان کے ساتھی اس گروہ کے قائد ہیں۔

⁂

حکومت برطانیہ کو چونکہ ہندوستان کے مختلف گروہوں کی کشمکش میں فیڈریشن کے نفاذ کا کوئی قرینہ نظر نہیں آتا تھا اس لئے اس نے گاندھی جی اور ان کے ہم خیال ساتھیوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی جو فیڈریشن کے حامی تھے اور یہی لوگ چونکہ ہندوستان کے (۸) صوبوں میں با اختیار بھی

تھے اس لئے ان کی مدد سے فیڈریشن کے مسئلہ کو حل کر لینا برطانیہ کو آسان معلوم ہوا۔ چنانچہ برطانیہ کی طرف سے اس حوصلہ افزائی کے بعد کانگرس کے ہم خیال لیڈروں نے ریاستوں کی طرف توجہ کی اور ۱۹۳۸ء میں چند ریاستوں کو مخصوص کر کے وہاں ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ لیکن ریاستوں میں عدم مداخلت کے متعلق چونکہ کانگرس کی ایک قرارداد پہلے سے موجود تھی اور اس کی موجودگی میں اصولاً کانگرس ریاستوں کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتی تھی اس لئے کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کر کے اس آئینی روک کو بھی دور کیا گیا اور ریاستوں میں کانگرسیوں کی "انفرادی" مداخلت کو جائز قرار دیا گیا۔

ایجی ٹیشن کے لئے کانگرس نے ابتداً ٹراونکور، میسور، حیدر آباد، جے پور اور راج کوٹ کو منتخب کیا، ان ریاستوں میں کانگرس کمیٹیاں بنیں اور ہندوستان کے کانگرسی لیڈروں کی قیادت میں یہ ایجی ٹیشن شروع ہوا لیکن ٹراونکور اور میسور میں ایجی ٹیٹروں کے قدم نہ جم سکے ان ریاستوں نے نہایت سختی سے ان کا مقابلہ کیا اور بے تکلف لاٹھی اور گولیوں سے ان کی تواضع کی۔ حیدر آباد میں بھی کانگرسی ایجی ٹیشن کو کامیابی نہیں ہوئی وہاں اس ایجی ٹیشن کے دوران ہی میں ہندو مسلم سوال اٹھ کھڑا ہوا جس کے باعث گاندھی جی نے اس ایجی ٹیشن کو روک دینے کا حکم دیدیا البتہ آریوں کا فرقہ وارا ایجی ٹیشن حیدر آباد میں جاری رہا اور جو کام کانگرس سے نہ ہو سکا تھا وہ اس نے پورا کیا جے پور کی صورت بھی یہی ہوئی۔ یہاں بھی کانگرسی ایجی ٹیشن کو ناکامی ہوئی، اور ریاست نے پوری قوت سے اس ایجی ٹیشن کو کچل کر رکھ دیا۔

راج کوٹ کے ایجی ٹیشن نے البتہ بہت دلچسپ صورت اختیار کر لی۔ اس ایجی ٹیشن کے بانی گاندھی جی کے رفیق خاص سردار ولبھ بھائی پٹیل سنیئے۔ انہوں نے ایجی ٹیشن کے ابتدا ہی میں ٹھاکر صاحب راج کوٹ اور راجکوٹ کے رزیڈنٹ کے درمیان غلط فہمی پیدا کر کے ٹھاکر صاحب سے ایک تحریر حاصل کر لی جس میں ٹھاکر صاحب نے یہ وعدہ کر لیا کہ راجکوٹ میں اصلاحات نافذ کر دی جائینگی۔ لیکن اس وعدے کی بنیاد پر جب ولبھ بھائی پٹیل نے راجکوٹ کے لئے اصلاحات مدون کرنے والی کمیٹی میں اپنی پارٹی کی اکثریت کا مطالبہ کیا تو ٹھاکر صاحب نے اسے منظور نہیں کیا اس پر بات بڑھ گئی۔ ولبھ بھائی پٹیل کا بیان تھا کہ ٹھاکر صاحب کے وعدے کا مفہوم ہی یہ تھا کہ اصلاحات کی ترتیب کا کام وہ ہمارے ہاتھ میں دیں گے اور ٹھاکر صاحب کہتے تھے کہ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اصلاحات بھی کانگرس ہی مرتب کرے گی۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولبھ بھائی پٹیل نے پھر راج کوٹ میں ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اور اس میں حصہ لینے کے لئے خود گاندھی جی بہ نفس نفیس راج کوٹ پہنچ گئے۔

ابتداءً گاندھی جی نے ولبھ بھائی پٹیل اور ٹھاکر صاحب میں صلح صفائی کرا دینی چاہی اور ٹھاکر صاحب پر زور بھی دیا کہ وہ اپنے وعدہ پر قائم رہیں اور اصلاحات کی تیاری کا کام بھی ولبھ بھائی پٹیل کے سپرد کر دیں لیکن جب ٹھاکر صاحب کسی طرح راضی نہ ہوئے تو گاندھی جی نے اعلان کر دیا کہ وہ "مرن برت" رکھیں گے اور اس وقت تک اپنا برت نہ توڑیں گے جب تک ٹھاکر صاحب ان کی بات نہ مان لیں۔ لیکن ایک طرف تو یہ مرن برت رکھا دوسری طرف وائسرائے سے اس معاملہ میں مداخلت کی درخواست کر دی۔ مدالت کے

نے گاندھی جی اور ان کے رفقاء کی درخواست پر فوراً راجکوٹ کے معاملہ میں مداخلت کی اور گاندھی جی کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ اس قضیہ کو فیصلہ کے لئے فیڈرل کورٹ میں پیش کر دیں۔ گاندھی جی اس پر راضی ہو گئے اور برت توڑ دیا۔ فیڈرل چیف جسٹس سر مارس گائر نے فیصلہ دیدیا کچھ گاندھی جی کی طرف کچھ ٹھاکر صاحب کے حق میں لیکن جب اس پر عمل کا وقت آیا بعض ایسی نئی نئی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ گاندھی جی ان کو حل نہ کر سکے اور مجبوراً اپنی شکست کا اعلان کر کے سر مارس گائر کے فیصلہ سے دست برداری کر لی اور اصلاحات کا کام ٹھاکر صاحب کے سپرد کر کے راجکوٹ سے واپس چلے آئے۔ ع۵

راج کوٹ میں شکست کھانے کے بعد گاندھی جی نے ساری ریاستوں میں

ع۵۔ راج کوٹ کے معاملہ میں گاندھی جی کی شکست کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے ہم نے اپنی کتاب "عہد حاضر کے بڑے لوگ" حصہ اول طبع دوم پر یہ لکھا تھا ۔

"راجکوٹ کی شکست کے بعد گاندھی جی نے مسلسل کئی بیانوں میں "اہنسا" کے عقیدے پر روشنی ڈالی ہے اور ان اسباب کا جائزہ لیا ہے جن کے باعث راجکوٹ ستیہ گرہ بالکل ناکام رہا۔ ان میں سب سے اہم سبب یہ بتایا ہے کہ جس اصول پر راجکوٹ میں ستیہ گرہ شروع ہوا تھا وہ "اہنسا" کے اصول کے مطابق نہیں تھا یعنی اس میں جبر کا پہلو تھا اور جب ستیہ گرہ میں جبر کا پہلو پیدا ہو جائے تو اس کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔

ستیہ گرہ کے اس فلسفے پر یہاں گفتگو کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ سمجھنے کی بات انہیں صرف اسقدر ہے کہ گاندھی جی جو ہندوستان بھر میں "اہنسا" کے واحد عالم باعمل اور تحریک ستیہ گرہ کے موجد ہیں برسوں کے ریاض کے بعد بھی اپنے عمل کو اس عقیدے کی صحیح روح سے مطابق نہ کر سکے تو ہندو عوام سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ اس فلسفے کو صحیح طور پر سمجھ سکیں گے اور اس پر عمل بھی کر سکینگے؟ (مولف)

ستیہ گرہ کو بند کرنے کا "حکم" دیدیا۔ اور ریاستوں کی کانگرس کمیٹیوں کو یہ ہدایت کی کہ اپنے کم سے کم مطالبے ریاستوں کی حکومتوں کے آگے پیش کریں اور انہیں گفت و شنید کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گاندھی جی کے اس اعلان کے ساتھ ہی ان کی جماعت نے فیڈریشن کو ہندوستان میں کامیاب بنانے کے لئے ریاستوں میں بیداری پیدا کرنے کی جو اسکیم بنائی تھی انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور کانگرس کے دوسرے گروہ کو جو سرے سے فیڈریشن ہی کے خلاف تھا گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے مقابل ملک میں ابھرنے کا موقع مل گیا۔

کانگرس میں اس پھوٹ کا ملک کی سیاسی فضا پر نہایت اچھا اثر ہوا اور وہ خطرہ دور ہو گیا جو گاندھی جی کی جماعت کی ریاستی سرگرمیوں کے باعث ملک کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً فیڈریشن کے نفاذ کے امکان کے متعلق پیدا ہو گیا تھا۔

اس جگہ یہ بات اور واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ کانگرس نے جس انداز سے ریاستوں میں ایجی ٹیشن شروع کیا تھا اسے عام مسلمانوں نے نہایت بری نظر سے دیکھا تھا اور خصوصاً حیدرآباد ایجی ٹیشن کے خلاف تو ان میں سخت بےچینی پیدا ہو گئی تھی جس کے باعث کئی جگہ ہندو مسلم فساد بھی ہو گئے تھے لیکن کانگرس نے چونکہ ریاستوں میں اصلاحات کے نام پر یہ ہنگامے شروع کئے تھے اس لئے یہ اندیشہ بھی تھا کہ مسلم رائے عامہ کہیں اس سے دھوکا نہ کھا جائے۔ چنانچہ اس احتمال کو دور کرنے میں مسلم لیگ نے رہنمائی کی اور مسٹر محمد علی جناح نے دسمبر ۱۹۳۸ء کے پٹنہ والے اجلاس میں

کانگریس کے اس ایجی ٹیشن پر تفصیل سے نظر ڈالتے ہوئے فرمایا:-

"دستوری ترقی کے متعلق دیسی ریاستوں کے باشندوں کی خواہشات کے ساتھ مجھے دلی ہمدردی ہے۔ لیکن میں انکو دیسی ریاستوں میں کانگریس کے ایجی ٹیشن کا اصلی مقصد بتا دینا چاہتا ہوں۔ کانگریس ریاستوں میں امن قائم کرنا نہیں چاہتی بلکہ کانگریس والے ریاستوں کے باشندوں سے ایک رابطہ قائم کرنا چاہتے ہیں اور اس کا مقصد فیڈرل اسمبلی میں اکثریت حاصل کرنا ہے تاکہ مسلمانوں پر وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکیں۔ اگر کانگریس ریاستوں میں اپنا جال پھیلانے سے باز نہ آئیگی تو لیگ کے اس دستور کے باوجود کہ "مسلم لیگ ریاستوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کریگی۔ مجھے مسلمانوں کی مدد کے لئے پہونچنا پڑیگا"

لیکن لیگ کو ریاستی مسلمانوں کی مدد کے لئے کوئی عملی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی اس لئے کہ مسلسل ناکامیوں کے بعد کانگریس ایجی ٹیشن ہر جگہ بند ہو چکا تھا۔

مسلم لیگ کے اس اجلاس کو یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اس اجلاس میں لیگ نے اپنی سابقہ روایات کے خلاف یہ تجویز بھی منظور کی کہ "مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے سلسلہ میں اگر ضرورت پیش آئی تو مسلم لیگ براہ راست عملی قدم اٹھائیگی"

چھبیسواں باب ۲۶

کانگرس کے دائیں اور بائیں بازو میں کشمکش

"فیڈریشن" کے مسئلہ میں جس انداز سے کانگرس میں پھوٹ پڑی اس سے کانگرس کے وقار پر بڑی سخت ضرب لگی۔ کانگرس میں اعتدال پسند اور انتہا پسند دونوں طرح کے افراد ہمیشہ سے شامل چلے آتے ہیں لیکن ان کے آپس کے اختلافات کبھی ایسے نمایاں نہیں ہوئے تھے جیسے اس مسئلہ میں ظاہر ہوئے ۱۹۳۸ء کے صدر کانگرس سبھاش چندر بوس کو گاندھی جی اور ان کی جماعت سے یوں تو اکثر مسائل میں اختلاف تھا لیکن سب سے زیادہ شدید اختلاف جس نے سبھاش چندر بوس کو گاندھی جی کے مقابل کر دیا وہ فیڈریشن پڑا سبھاش چندر بوس نے گاندھی جی کی ساری جماعت پر یہ الزام لگایا کہ یہ لوگ فیڈریشن کے حامی ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے مددگاروں پر مشتمل فیڈرل وزیروں کی ایک فہرست بھی پہلے سے تیار کر رکھی ہے، اور اب ریاستی ایجی ٹیشن کے ذریعہ فیڈریشن کے نفاذ کیلئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ یہ الزام گاندھی جی کی جماعت یا کانگرس ورکنگ کمیٹی پر اسوقت لگایا گیا جب ۱۹۳۹ء کیلئے صدر کانگرس کے انتخاب کا مسئلہ درپیش تھا اور گاندھی جی نے صدارت کی امیدواری کے لئے "پٹا بھائی سیتا رامیا" کو اپنی طرف سے

تجویز کیا تھا سبھاش چندر بوس نے گاندھی جی کی اسی تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے سارے کانگرس ورکنگ کے ممبروں پہ یہ الزام لگایا تھا اور چیلنج کیا تھا کہ یہ لوگ اس الزام سے اپنے آپ کو بری ثابت کریں۔

سبھاش بوس کے اس چیلنج کا اثر یہ ہوا کہ گاندھی جی کا پیش کردہ امیدوار (ڈاکٹر پٹا بھائی سیتارامیا) صدر منتخب نہ ہو سکا اور سبھاش چندر بوس ہی دوسرے سال کے لئے صدر کانگرس منتخب ہو گئے۔

⁂

یہ بات کانگرس کی سابقہ روایات کے بالکل خلاف تھی، قیام کانگرس کے بعد سے ۱۹۳۹ء تک کبھی کانگرس کی صدارت کے لئے ایک سے زیادہ امیدوار میدان میں نہیں آئے تھے اس سال پہلی مرتبہ صدارت کے لئے امیدواروں کا مقابلہ ہوا اور اس مقابلہ میں گاندھی جی اور ان کی جماعت کو شکست کھانی پڑی۔ اس شکست کو گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں نے بری طرح محسوس کیا۔ چنانچہ ساتھیوں نے تو کانگرس ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور گاندھی جی نے اپنی توجہ راجکوٹ کی طرف پھیر لی اور عملاً کانگرس سے بے تعلق ہو گئے۔

کانگرس کی ورکنگ کے ممبروں کے مستعفی ہونے سے صورت حال بہت نازک ہو گئی اور کانگرس کی ساری ذمہ واری سبھاش چندر بوس پہ آپڑی۔ اگرچہ چند ذمہ دار افراد نے اس موقع پہ سبھاش چندر بوس اور گاندھی جی اور ان کے ساتھیوں کے درمیان مصالحت کرا دینے کی کوشش کی لیکن گاندھی جی اس پہ راضی نہ ہوئے اور نہ ان کے ساتھی جو کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اپنے استعفےٰ واپس لینے پر مائل ہوئے ان لوگوں کو

شکایت یہ تھی کہ سبھاش چندر بوس نے ان پر یہ الزام لگایا ہے کہ وہ فیڈریشن کے حامی ہیں جب تک یہ الزام واپس نہ لیا جائیگا وہ ورکنگ کمیٹی میں کام نہ کرینگے اور سبھاش چندر بوس اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس الزام کو واپس لیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "تری پوری" کے اجلاس کانگرس تک آپس میں یہی کشمکش جاری رہی۔

تری پور کانگرس کے اجلاس میں پنڈت پنت وزیر اعظم یو پی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں سبھاش چندر بوس کو جدید ورکنگ کمیٹی کی ترتیب میں گاندھی جی کے مشورے کا پابند بنا دیا۔ یہ بڑے جھگڑے کی چیز تھی، قانوناً صدر کانگرس کو اپنی کابینہ بنانے میں ایک ایسے شخص سے مشورے لینے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا جو کانگرس کا چار آنے والا ممبر بھی نہ ہو لیکن سبھاش چندر بوس کے پیرو اس موقع پر لڑ کر کانگرس میں پھوٹ ڈالنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے انہوں نے اس تجویز کو مان لیا۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ گاندھی جی ورکنگ کمیٹی کی ترتیب میں سبھاش بوس سے تعاون کرنے پر کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ یہ صورت ایسی تھی کہ سبھاش بوس اس کا کوئی حل نہیں تلاش کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ صدارت سے استعفیٰ دیکر ہٹ جائیں چنانچہ انہوں نے یہی آخری صورت اختیار کی اور کانگرس کی صدارت سے استعفےٰ پیش کر دیا۔

کانگرس کی صدارت سے مستعفی ہو کر سبھاش چندر بوس نے "فارورڈ بلاک" کے نام سے اپنی ایک علیحدہ جماعت بنالی اور "کانگرس ہائی کمانڈ" کے احکام پر سختی سے نکتہ چینی شروع کر دی۔ ان نکتہ چینیوں کو کانگرس برداشت

کرنے کے لئے تیار نہیں تھی اس نے مسٹر سبھاش چندر بوس کو تین برس کیلئے کانگرس سے نکال دیا۔ یہ بڑا غلط اقدام تھا، اس نے سبھاش چندر بوس کے فارورڈ بلاک کو ملک میں بڑی تقویت پہونچائی۔ سوشلسٹ گروپ سارے کا سارا سبھاش بوس کے ساتھ ہو گیا اور کانگرسی مسلمان بھی اسی نئی پارٹی کی طرف جھک گئے۔ سبھاش چندر بوس نے مسلمانوں کے اس رجحان سے فائدہ اٹھا کر یہ کوشش کی کہ مسلم لیگ اور فارورڈ بلاک میں سمجھوتہ ہو جائے اس لئے کہ فیڈریشن کے معاملہ میں فارورڈ بلاک کا بھی وہی عقیدہ تھا جو مسلم لیگ کا تھا لیکن سبھاش چندر بوس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی اس لئے کہ مسلم لیگ کے سامنے صرف فیڈریشن کا مسئلہ نہیں تھا، بلکہ دستور ۱۹۳۵ء میں بھی مناسب ترمیم پیش نظر تھی۔ اور سبھاش بوس کی پارٹی کے اتحاد سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر چہ سبھاش بوس کو مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے میں ناکامی ہوئی لیکن بعض چھوٹی چھوٹی مسلم جماعتوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے چنانچہ احرار اور جمعیتہ العلماء کو فارورڈ بلاک سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور اس طرح سبھاش بوس کے فارورڈ بلاک کو کانگرس کے مقابل ملک میں ایک سیاسی جماعت کی حیثیت حاصل ہوتی گئی۔

کانگرس نے اپنی اکثریت والے صوبوں میں وزارتیں سنبھالتے ہی وزارتوں کی رہنمائی کے لئے ایک کانگرس پارلیمنٹری بورڈ بنا دیا تھا جسے عام طور پر "کانگرس ہائی کمانڈ"، کہا جاتا ہے اگر چہ کانگرس ہائی کمانڈ وزارتوں کو مشورہ دینے کے لئے جمہوری اصولوں پر قائم کیا گیا تھا لیکن رفتہ رفتہ

اس نے ملک میں "ڈکٹیٹری" کی شان اختیار کر لی۔ اور اس کے فیصلہ کانگرس کے ہر شعبے میں ناطق سمجھے جانے لگے۔ اصولاً کانگرس ہائی کمانڈر کو آل انڈیا کانگرس کے آگے جواب دہ ہونا چاہیئے لیکن یہ آل انڈیا کانگرس کے بجائے گاندھی جی کے آگے اپنے آپ کو جوابدہ سمجھنے لگا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگرس کے اکثر ممبروں کو اس کے رویہ سے شکایت پیدا ہوئی اور جب یہ شکایت گفت و شنید سے دور نہ ہو سکی تو انھی غیر مطمئن کانگرسیوں نے ایک نئی سیاسی پارٹی بنا ڈالی۔ اور اپنے لئے "بائیں بازو" کا نام تجویز کر لیا۔ "فارورڈ بلاک" کے قیام کی یہی وجہ تسمیہ ہے!

گاندھی جی اور ان کی جماعت کی سیاست پر بائیں بازو کی طرف سے جو اعتراضات ہوئے ہیں ان میں سب سے بڑا اور اصولی اعتراض یہی ہے کہ گاندھی جی کی حیثیت اس وقت ملک میں ایک ڈکٹیٹر کی سی ہے جنکی نگرانی میں کانگرسی لیڈروں کی ایک چھوٹی سی جماعت "کانگرس ہائی کمانڈ" کے نام سے۔ جمہور کی آواز اور خود کانگرس کے مختلف الخیال افراد سے مشورہ کئے بغیر ملک پر حکومت کر رہی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کانگرس اب جمہوری جماعت نہیں رہی بلکہ ایک فاشسٹ جماعت بن گئی ہے جس میں مختلف الخیال افراد کی گنجائش باقی نہیں۔ بائیں بازو کے اس اعتراض میں یقیناً معقولیت بھی ہے اور وزن بھی ہے! اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہر بڑے ادارے کے کام کرنے والوں میں ہمیشہ سے ہم خیال افراد کی ایک چھوٹی سی پارٹی ہی ہوا کرتی ہے تب بھی یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ جو جماعتیں جمہوری اصول پر قائم ہوئی ہیں ان میں اپنے سے مختلف الخیال افراد کے افکار و آرا پر رواداری سے غور کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی؟

یا ایسے افراد کو اپنے یقین و ایمان کے خلاف ایک خاص پارٹی کی ہمنوائی پر مجبور کیا جاسکتا ہے ؟

کانگرس ممکن ہے کبھی جمہوری جماعت رہی ہو لیکن آج یقیناً اس کی حیثیت ایک فاشسٹ جماعت سے مختلف نہیں۔ نہ جمہور کی آواز کو اس کے فیصلوں میں دخل ہے اور نہ جماعت کے افراد کو ان پر منہ کھولنے کا حق حاصل ہے۔

کانگرس پر بائیں بازو کا دوسرا بڑا اعتراض یہ ہے کہ کانگرس والوں نے اپنے انتخابی اعلان پر عمل نہیں کیا یعنی نئے آئین کے ماتحت عہدے قبول کر کے جس پروگرام پر عمل کیا، اس سے جدید دستور کو بڑی تقویت حاصل ہوئی حالانکہ کانگرس والوں نے وزارتوں پر قبضہ کرنے سے پہلے یہ یقین دلایا تھا کہ وہ عہدے قبول کر کے دستور جدید کے نفاذ کو بے اثر بنا دیں گے۔ اس اعتراض کا کانگرس کی طرف سے کبھی کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اور واقعہ یہ ہے کہ کانگرسی وزارتوں نے جس طرح نئے آئین کو کامیاب بنانے کی کوشش کی اس کے پیش نظر ان کا کوئی جواب ہو بھی نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کانگرس کی طرف سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے کانگرس کے تعمیری پروگرام کی تکمیل کی سعی کر کے حتی المقدور عوام کو فائدہ پہونچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ جواب کانگرس کو زیب نہیں دیتا اس لئے کہ کانگرس وہ جماعت ہے جس نے دستور جدید کو مسترد کر دیا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ یہ دستور ہندوستانیوں کے لئے ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ وزارتیں بھی اسی لئے قبول کی تھیں کہ کسی طرح اس دستور کو بےکار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ آسکے۔ البتہ ملک کے لبرل

حضرات نے دستور جدید کو قبول کرتے ہوئے یہ رائے دی تھی کہ اگرچہ دستور
جدید ہندوستان کی توقعات کو پورا نہیں کرتا لیکن اسے قبول کرکے اس
سے جسقدر زیادہ اٹھایا جاسکے اٹھالینا چاہیئے۔ اس اعتبار سے اگر کانگرس کے
بجائے لبرل وزارتیں ہوتیں تو یہ جواب موزوں بھی ہوتا لیکن کانگرس کیلئے
یہ انتہائی غیر موزوں جواب ہے اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کانگرس
کے عقیدے اور عمل میں مطلق یکسانیت نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسی
جماعت ہے جس کے ظاہری پُرزور فیصلوں سے اس کی "نیت" پر حکم
نہیں لگایا جاسکتا۔

ستائیسواں باب

مدح صحابہ کا ایجی ٹیشن

مسجد شہید گنج کے معاملہ میں احرار سے جو لغزش ہوئی اس نے انہیں بہت نقصان پہونچایا جو اثر انہوں نے کشمیر اور قادیان ایجی ٹیشن میں مسلمانوں پہ حاصل کر لیا تھا وہ زائل ہو گیا اور ان کی جماعت سیاسی حیثیت سے محض بے قیمت ہو کر رہ گئی۔ اس کا ردعمل خود احرار پہ یہ ہوا کہ ایک مدت تک انہوں نے ملک کی کسی تحریک میں عملاً حصہ نہیں لیا البتہ جماعت کو زندہ رکھنے کے لئے قادیانوں کے خلاف 'جہاد' کا مشغلہ بدستور جاری رکھا۔

۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے شیعہ اور سنیوں میں تبرہ اور مدح صحابہ کا ناگوار قضیہ چھڑ گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نازک صورت اختیار کر لی واقعہ یہ ہے کہ لکھنؤ کے شیعوں اور سنیوں میں یہ جھگڑا ۱۹۰۸ء سے چلا آرہا تھا' شیعہ تعزیہ نکالتے تھے اور سنی چار یاری جھنڈا' وہ تبرہ پڑھتے تھے یہ مدح صحابہ' دو ایک دفعہ آپس میں لڑائی جھگڑا بھی ہوا حکومت نے مداخلت کی اور سنیوں کو حکم دیدیا کہ وہ "مدح صحابہ" بازاروں میں

نہ پڑھا کریں۔ یہ حکم سنیوں کے لئے باعث اشتعال تھا انہوں نے اس کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

لکھنو میں یہ صورت حال تھی جب "احرار" نے یہ طے کیا کہ وہ "مدح صحابہ" کے ایجی ٹیشن کی رہنمائی کرینگے چنانچہ ان کے جتھے پنجاب سے لکھنو پہونچنے لگے اور کانگرسی حکومتوں کے خلاف ان کا ایجی ٹیشن شروع ہو گیا۔

لکھنو کے شیعوں نے جب دیکھا کہ مدح صحابہ کے ایجی ٹیشن میں حصہ لینے کے لئے لوگ باہر سے بلوائے جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی پنجاب ہی سے شیعوں کے جتھے لکھنو بلوانے شروع کر دیئے اس طرح دونوں طرف برابر کے اکھاڑے قائم ہو گئے۔ ایک طرف سے شیعوں کا جلوس تبرہ کرتا ہوا نکلتا اور پکڑا جاتا دوسری طرف احراری مدح صحابہ پڑھتے ہوئے نکلتے اور گھیر لیے جاتے۔ ہزاروں کی تعداد میں شیعہ سنی جیلوں میں بھر گئے لیکن باہر کے جتھے آتے رہے جس کے باعث دونوں طرف برابر اشتعال قائم رہا اور آپس میں مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی بلکہ طرفین سے اشتعال میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کا جس انداز سے مظاہرہ ہوا اس کا اثر لکھنو کے باہر بھی شیعوں اور سنیوں پر پڑا اور الہ آباد اور گورکھپور میں بھی اسی سلسلہ میں کچھ ناگوار واقعات پیش آ گئے غرض جب حالات نازک صورت اختیار کر گئے۔ اور کانگرسی حکومت ان حالات پر قابو پانے میں بے بس اور مجبور نظر آنے لگی تو کچھ ذمہ دار حضرات نے کانگرس اور مسلم لیگ سے درخواست کی وہ اس قضیہ کو اپنی مداخلت سے طے کرا دے۔ چنانچہ کانگرس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد اس پر

آمادہ ہوئے کہ شیعوں اور سنیوں کی اس نزاع کو ختم کرادیں چنانچہ انہوں نے شیعوں اور سنیوں دونوں جماعتوں کے ذمہ وار افراد سے گفتگو بھی شروع کر دی لیکن ابھی یہ گفتگو چل ہی رہی تھی۔ کہ پنجاب کی ایک اور جماعت اس ایجی ٹیشن میں مداخلت کے لئے لکھنؤ پہونچ گئی یہ جماعت "خاکسار" تھی۔

"خاکسار" کے نام سے ۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان پنجاب میں ایک جماعت نمودار ہوئی تھی جس نے اپنا مقصد، فوجی لائنوں پر اپنی تنظیم اور سوشیل خدمت قرار دیا تھا، مدت تک یہ جماعت نہایت خاموشی سے اپنے مقصد کی تکمیل کرتی رہی اور کبھی کسی سیاسی تحریک میں حصہ نہ لیا بلکہ انہوں نے اپنا مسلک ہی یہ بنا لیا کہ وہ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں میں سے کسی کا ساتھ نہ دیں اور سیاست سے براہ راست کوئی تعلق نہ رکھیں چنانچہ اپنے قیام کے بعد عملاً اس جماعت نے کبھی ایجی ٹیشن میں حصہ نہیں لیا تھا لیکن ۱۹۳۹ء میں اس نے تبرہ اور مدح صحابہ کے ایجی ٹیشن کو ختم کرانے کا نوٹس دیا اور اپنے باقاعدہ جتھے لکھنؤ بھیجنے شروع کر دئے۔ اس نئی جماعت کی آمد سے لکھنؤ کی فضا اور زیادہ خراب ہو گئی اور گفتگوئے مصالحت کا امکان جاتا رہا کانگرسی حکومت حالات کی اس رفتار سے پریشان تو تھی ہی اُسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اس نئی جماعت کی آمد سے لکھنؤ میں کشت وخون نہ ہونے لگے اس نے فوراً خاکساروں کے اجتماع کے خلاف دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ خاکساروں نے اس کی خلاف ورزی شروع کر دی اور گرفتار ہونے لگے لیکن گرفتاری سے پہلے یہ پولس سے مقابلہ بھی کرتے تھے۔ جسکی وجہ سے پولس اور احرار کے زخمیوں کی تعداد روز بہ روز بڑھنے لگی۔ کانگرسی حکومت نے ان حالات پر قابو پانے

کے لئے خاکساروں کے لیڈر علامہ مشرقی کو بھی گرفتار کر لیا لیکن ان کی گرفتاری کے بعد خاکساروں میں اور زیادہ اشتعال پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ سے خاکساروں کے جتھے لکھنو روانہ ہونے لگے اس کی روک تھام کے لئے کانگرسی حکومت نے اودھ کے سرحدی مقامات پر پولیس کے دستے متعین کر دئے۔ ان دستوں سے اکثر مقامات پر خاکساروں کا مقابلہ بھی ہوا اور ایک جگہ پولس نے گولی بھی چلا دی جس کے باعث پانچ خاکسار ہلاک ہو گئے۔

یہ حالات اسقدر تیزی سے پیدا ہوتے چلے گئے کہ سارے ملک کے مسلمانوں میں ایک سنسنی سی پھیل گئی اور ہر طرف سے کانگرسی حکومت اور ملک کی سیاسی جماعتوں پر زور پڑنے لگا کہ جلد اس صورت حال کو قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ یہی آگ اور مقامات پر نہ لگ جائے۔

مولانا ابو الکلام آزاد نے پھر شیعوں اور سنیوں سے گفتگو شروع کر دی مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح نے علامہ مشرقی سے بات چیت کی۔ مفاہمت اور مصالحت کے امکانات پیدا ہو گئے اور طرفین سے ایجی ٹیشن عملاً بند کر دیا گیا۔

لکھنو کے اس جھگڑے کا مسلمانوں کی ذہنیت پر بہت برا اثر پڑا۔ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کے باعث عام طور پر یہ احساس پیدا ہونے لگا تھا کہ اب مسلمانوں کو اپنے اختلافات بھلا کر ایک مرکز پر جمع ہو جانا چاہیئے، لکھنو کے اس واقعہ سے اس احساس کو ٹھیس لگی، پہلے ہی مسلمانوں میں کیا کم اختلافات تھے کہ شیعہ سنی اختلاف کو ایک نئی صورت میں اچھال دیا گیا، بہر حال یہ واقعہ ہی اپنی نوعیت کے اعتبار سے جسقدر نامناسب تھا اسی قدر ناگوار نتائج کا بھی حامل تھا اودھ کے شیعوں اور سنیوں میں ان ہنگاموں کے بعد ایک قسم کی کشیدگی

سی پیدا ہوگئی اور کچھ دنوں تک کے لئے ان میں سیاسی معاملات پر بھی اتحاد فکر و خیال ناممکن ہو گیا۔ لیکن صرف اس ایک ناگوار واقعہ کے سوا جسکا اثر زیادہ تر صوبہ اودھ میں محدود رہا ملک میں اور کوئی ایسا ناگوار واقعہ ظہور میں نہیں آیا جو "وحدت اسلامی" کی تعمیر میں روک ثابت ہوتا مسلم لیگ کانگریس اور کانگریسیوں کی مخالفت کے علی الرغم ملک کی سیاست میں برابر اپنے لئے جگہ بناتی رہی اور عوام مسلمانوں میں روز بروز اس کا اعتبار بڑھتا رہا۔

اٹھائیسواں باب

یورپین جنگ کا آغاز اور کانگرسی وزیروں کے استعفے

اگست ۱۹۳۹ء میں یورپ کی سیاسی فضا مکدر ہو گئی اور ہر لمحہ جنگ چھڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا اسی نئی صورت حال نے ہندوستان کی سیاست پر بھی اثر ڈالا اور ملک کی سیاسی جماعتوں کے لئے قبل از قبل یہ طے کرنا ضروری ہو گیا کہ جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ان کی جماعتی پالیسی کیا ہو گی۔ اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے لیگ اور کانگرس نے فوراً اپنی اپنی کونسلوں کے اجلاس طلب کئے احرار، جمعیتہ العلماء، اور مہاسبھا نے بھی اپنی مجالس عاملہ کے اجلاس بلائے، لبرل اور اچھوت بھی اس موقع پر بیدار ہو گئے اور انہوں نے بھی اپنے جماعتی نقطہ نظر سے اس مسئلہ پر سوچ بچار کرنا شروع کر دیا۔ غرض ملک کی ساری سیاسی جماعتیں اس موقع پر بیدار تھیں اور جنگ کے دوران میں ہندوستانیوں کی روش کے متعلق مختلف زاویوں سے غور ہونے لگا۔

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ملک کی اور جماعتوں سے پہلے ہوا اور اس اجلاس میں جنگ کے متعلق مسلم لیگ کی پالیسی کے تعین میں سخت معرکہ پڑا۔ بعض ممبر اس موقع پر حکومت برطانیہ سے مقاطعہ کرنا چاہتے تھے اور بعضوں کی

یہ رائے تھی کہ اس جنگ میں مسلمان غیر مشروط طور پر حکومت برطانیہ کا ساتھ دیں اس بحث میں نزاکت اس لئے اور پیدا ہو گئی تھی کہ مسلم لیگ کے دو ذمہ دار لیڈر سر سکندر حیات خاں اور مولوی فضل الحق نے اپنے اپنے صوبوں کی طرف سے حکومت برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کر دیا تھا اگرچہ یہ دونوں حضرات پنجاب اور بنگال کے وزیر اعظم بھی تھے لیکن ان کی ایک حیثیت مسلم لیگ کے رکن کی بھی تھی اس لئے ان پر اعتراض یہ تھا کہ ان دونوں نے لیگ کونسل سے مشورہ کئے بغیر ایسے بیان کیوں شائع کر دئے جن سے ملک میں یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ یہ مسلم لیگ کی رائے ہے۔

دو دن تک لیگ کونسل کے اجلاس میں یہی مسئلہ زیر بحث رہا اور جب برطانیہ کی حمایت اور مخالفت کرنے والی جماعتوں کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تو مسٹر محمد علی جناح نے انتہائی تدبیر سے کام لیکر جنگ کے مسئلہ میں مسلم لیگ کے فیصلہ کو کانگریس کے فیصلہ تک ملتوی کر دیا۔

در اصل مسلم لیگ کو جنگ کے مسئلہ میں ایک قطعی فیصلہ کرنے سے پہلے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق برطانوی پالیسی کا بھی جائزہ لینا تھا اور اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت تھی کہ اس جنگ کے متعلق ہندوستان کی ہمسایہ اسلامی حکومتوں کی پالیسی کیا ہے افغانستان سے ترکی تک اسلامی حکومتیں، چونکہ معاہدہ سعد آباد کے ذریعہ ایک رشتہ میں منسلک ہو گئی تھیں اور ترکی نے آئندہ جنگ میں برطانیہ اور فرانس کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا تھا، جس کے معنی یہ تھے کہ عراق، ایران اور افغانستان بھی ترکی کے ساتھ ہونے کی وجہ سے برطانیہ کی حلیف بن گئی تھیں۔ اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی

پالیسی متعین کرنے میں یہ خیال رکھنے کی ضرورت تھی کہ ان ہمسایہ اسلامی ممالک سے بھی ان کے تعلقات خراب نہ ہونے پائیں اور ہندوستان میں مسلم مفاد کی بھی حفاظت ہو سکے چنانچہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ملتوی کرنے کے بعد لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں اسی نقطہ نظر سے جنگ کے مسئلہ پر غور ہوتا رہا اور بالاخر ایک فارمولا تیار کر لیا گیا لیکن اس کا اعلان کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کے بعد ہی کیا گیا۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس جو لیگ کے اجلاس کے بعد ہی واردھا میں ہوا تھا اس میں بھی اس مسئلہ پر بڑی سخت کشمکش ہوئی، گاندھی جی ذاتی طور پر اس کے حق میں تھے کہ اس موقع پر برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کی جائے لیکن پنڈت جواہر لال اور چند دوسرے ممبروں کی رائے اس کے خلاف تھی وہ اس موقع پر برطانیہ سے "سودا" کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ کانگرس اپنے "بائیں بازو" کو بھی اپنے قابو میں رکھنا چاہتی تھی جو برطانیہ سے کسی قیمت مصالحت پر آمادہ نہیں تھا اور برابر اس پر زور دیرہا تھا کہ آئینی جدوجہد کو چھوڑ کر حکومت کے خلاف پھر ایک مرتبہ سول نافرمانی شروع کر دی جائے اب اگر کانگرس جنگ میں حکومت کی حمایت کا فیصلہ کرتی تو بایاں بازو، یقیناً اس سے بغاوت کر دیتا اور ملک میں ایک نئی قسم کی بےچینی پیدا ہو جاتی اور چونکہ اس موقع پر کانگرس میں پھوٹ پڑ جانے سے کانگرس کی طاقت ختم ہو کر رہ جاتی اس لئے جواہر لال نہرو نے کانگرس کی ان دونوں پارٹیوں کو ملائے رکھنے کے لئے ایک سوچا ہوا "رزولیوشن" کانگرس ورکنگ کمیٹی کے آگے پیش کر دیا۔ جس میں انہوں نے حکومت برطانیہ سے "مقاصد جنگ" کی وضاحت چاہی تھی۔ جس کے صاف معنی یہ تھے کہ جب تک حکومت برطانیہ

یہ وعدہ کرلے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی تسلیم کرلی جائیگی اسوقت
تک کانگرس جنگ میں حکومت برطانیہ کی حمایت نہیں کرسکتی۔ کانگرس کی
اس قرارداد سے بائیں بازو کی تو تشفی ہوگئی لیکن ملک میں بے اطمینانی
بڑھ گئی اور عام طور پر یہ کہا جانے لگا کہ کانگرس اس موقع پر برطانیہ کو مجبور
پاکر سودا کرنا چاہتی ہے۔

کانگرس کی اس قرارداد کے بعد مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے بھی جنگ
کے مسئلہ میں اپنا فیصلہ صادر کردیا، ایک طویل قرارداد میں اسلامی ممالک میں
برطانوی پالیسی کے نقائص کا ذکر کیا، اور ہندوستان میں نئے آئین کے
ماتحت کانگرسی حکومتوں کے قیام کے باعث مسلمانوں کو جو شکائتیں پیدا
ہوگئی تھیں ان کا اظہار کرتے ہوئے یہ شرط پیش کی جب تک حکومت برطانیہ
اسلامی ممالک کے مسلمانوں کی عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کی خصوصاً
ان شکایتوں کو دور کرنے کا وعدہ نہ کرے اسوقت تک مسلم لیگ یورپین
جنگ میں حکومت برطانیہ کی حمایت نہیں کرسکتی۔
لیگ میں اس قرارداد کی منظوری سے پہلے یہ اندیشہ پیدا ہوگیا تھا
کہ لیگ کے وہ ممبر (سر سکندر اور مولوی فضل الحق) جنہوں نے اس فیصلہ سے
پہلے برطانیہ کی غیر مشروط حمایت کا اعلان کردیا ہے لیگ سے علیحدہ ہوجائینگے
اور اس طرح لیگ میں پھوٹ پڑجائیگی لیکن ایسا نہیں ہوا سر سکندر اور
مولوی فضل الحق نے اپنے اعلانات کو انفرادی قرار دیا اور لیگ کے
فیصلہ کے آگے گردن ڈال دی۔ ان دونوں کے اس طرز عمل سے مسلم سیاست
میں جان پڑگئی مسلم لیگ کا ملک میں وقار بڑھ گیا اور حکومت اور کانگرس

دونوں پر اس کا بڑا اچھا اثر پڑا۔

⁂

ستمبر میں جنگ شروع ہو گئی حکومت ہند نے ہندوستان کی مدافعت کے لئے ایک اسکیم تیار کی اور اس اسکیم کو چلانے کے لئے ایک عارضی مرکزی حکومت کا خاکہ تیار کیا۔ لیکن کانگرس اور لیگ کے فیصلوں سے ملک کی سیاست میں انتشار پیدا ہو چکا تھا حکومت کی اس اسکیم سے ویسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا گیا جیسی حکومت چاہتی تھی وائسرائے نے اس مکدر فضا کو درست کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا، کانگرس، لیگ، اور ملک کی ساری چھوٹی بڑی پارٹیوں کے لیڈروں کو ملاقات کی دعوت دی اور عارضی مرکزی حکومت کا خاکہ غور و فکر کے لئے ان کے آگے پیش کیا، لیکن لیگ اور کانگرس کے نقطہ نظر میں اتحاد نہ ہو سکا اور وائسرائے کی یہ سعی بیکار گئی۔

کانگرس کے نمائندوں کو وائسرائے سے گفت و شنید کے دوران میں اس بات پر اصرار رہا کہ حکومت ہند صرف کانگرس کو ملک کی نمائندہ جماعت تسلیم کر لے اور ہندوستان کے نظم و نسق کی ذمہ داری اس پر ڈال دے لیکن وائسرائے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے اس لئے بھی کہ یہ مطالبہ مبنی بر حقیقت نہیں تھا اور اس لئے بھی کہ اس جنگ میں اسلامی ممالک برطانیہ کے ساتھ تھے ہندوستانی مسلمانوں کو اس نوبت پر کسی قسم کی شکایت کا موقع دینا خلاف مصلحت تھا۔ اس کے علاوہ دوران جنگ میں "مول تول" کرنے والی قوموں کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ "مارشل ریس" کی پرسش ہوا کرتی ہے اور کانگرس چونکہ اس موقع پر بھی "مول تول" پر اڑی ہوئی تھی اس لئے وائسرائے اور وزیر ہند نے نہ صرف کانگرس کے اس مطالبہ کو رد کر دیا

بلکہ کانگرس کی قرارداد کے جواب میں "مقاصد جنگ" کی تشریح بھی ایسے عنوان سے کی جو کانگرسیوں کو مطمئن نہ کر سکی۔

⁂

اس نوبت پر کانگرس کے لئے ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی وہ یہ کہ وزارتوں سے استعفٰے دیکر حکومت سے قطع تعلق کرلے چنانچہ اس مسئلہ پہ غور و خوض کرنے کے بعد کانگرس ورکنگ کمیٹی نے حکومت سے قطع تعلق کرنے کا اعلان کر دیا اور کانگرسی وزیر مستعفی ہو کر باہر آگئے لیکن یہ قطع تعلق صرف وزارتوں ہی تک محدود رہا، کونسلوں اور اسمبلیوں کے کانگرسی ممبروں کو استعفوں سے منع کر دیا گیا۔ کانگرس کو خیال تھا کہ شاید یہ دھمکی حکومت پہ کارگر ہو جائیگی اور وہ جھک کر کانگرس سے معاملہ کرلے گی لیکن انہیں اپنی اس توقع میں مایوسی ہوئی کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہوتے ہی حکومت نے دستور جدید کی دفعہ ۹۳ کے ماتحت سوائے صوبہ سندھ کے (جہاں مسلم لیگ نے وزارت بنالی) باقی سارے کانگرسی صوبوں کے نظم و نسق پہ براہ راست گورنروں کو قبضہ دیدیا۔

کانگرس کے اس اقدام کے بعد پھر ایک مرتبہ کانگرس اور لیگ کے لیڈروں کو وائسرائے نے طلب کیا اور چاہا کہ ان دونوں سے مفاہمت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے لیکن یہ کوشش بھی بیکار گئی حکومت اور کانگرس اور نہ کانگرس اور لیگ میں کسی نقطہ پر بھی اتحاد ہو سکا۔

وزارتوں سے استعفٰے دینے کے بعد یورپین جنگ میں ہندوستانی سپاہیوں سے کام لینے کے خلاف کانگرس نے ایک تجویز منظور کی اسی تجویز کو

احرار اور جمعیتہ العلماء نے بھی اپنے اجلاسوں میں دہرایا کانگریس اور جمعیتہ العلماء تو صرف تجویز پاس کر کے رہ گئے احرار نے اس پر عمل بھی کرنا شروع کر دیا، پنجاب یوپی اور دہلی میں انہوں نے اپنے کئی جلسے کئے اور اس میں ہندوستانی سپاہیوں کو ملک سے باہر بھیجنے کے خلاف احتجاج کیا، ملک میں جنگ کے باعث "ڈفنس آف انڈیا ایکٹ" نافذ کر دیا گیا تھا یہ تقریریں اسی کے ماتحت قابل تعزیر قرار پائیں اور دھڑا دھڑ احراریوں کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ جو برابر اب تک جاری ہیں۔

انتیسواں باب ۲۹

لیگ، کانگرس، اور حکومت کے درمیان گفت وشنید

مسلم لیگ چونکہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ اور موثر رہنمائی کے باعث مسلمانوں کی اکثریت کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کر لینے میں کامیاب ہو چکی تھی اس لئے اب وہ ہندوستانی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت سمجھی جانے لگی تھی اور حکومت اور کانگرس دونوں ملک کے اہم مسائل میں اس سے رجوع کرنے پر مجبور تھیں۔ چنانچہ جب دوران جنگ میں مرکزی عارضی حکومت کے قیام کا مسئلہ اٹھا تو وائسرائے نے لیگ اور کانگرس دونوں کے نمائندوں سے ساتھ ساتھ گفتگو کی تھی۔ اور کانگرس نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھا کر لیگ سے ایک دفعہ پھر مفاہمت کی کوشش کی۔

حکومت ہند اور مسلم لیگ کی مفاہمت کے سلسلہ میں لیگ کے نمائندے مسٹر محمد علی جناح نے مسلمانوں کی طرف سے وائسرائے کے آگے پانچ مطالبات پیش کئے تھے۔

(۱) مسلمان سپاہیوں کو ہندوستان سے باہر اسلامی ممالک سے لڑنے کے لئے نہ بھیجا جائے۔

(۲) دستور ۱۹۳۵ء منسوخ کیا جائے۔

(۳) کوئی جدید دستور یا عارضی انتظام بغیر مسلمانوں کی منظوری نافذ نہ کیا جائے۔

(۴) فلسطین کے عربوں کے ساتھ اطمینان بخش طریقہ پر مصالحت کی جائے۔

(۵) کانگرسی صوبوں میں مسلمانوں پر جو زیادتیاں ہوئیں ہیں ان کی تحقیقات کی جائے۔

ان شرائط پر وائسرائے نے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا چنانچہ کچھ دنوں بعد وائسرائے نے مسٹر جناح کو جواب بھیجا جس میں مطالبہ نمبر ۲ کو تسلیم کرتے ہوئے یہ وعدہ کیا کہ حکومت برطانیہ دستور ۱۹۳۵ء پر دوبارہ نظرثانی کریگی نمبر ۳ کے متعلق انہوں نے مسٹر جناح کو اطمینان دلایا کہ عارضی، یا مستقل دستور کی ترتیب میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا لحاظ رکھا جائیگا۔ اسی طرح چوتھے مطالبات کے متعلق بھی یہ یقین دلایا کہ فلسطین کے عربوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مطالبہ نمبر ۵ کا جو کانگرسی وزارتوں کے متعلق تھا۔ وائسرائے نے یہ جواب دیا کہ اب جبکہ کانگرسی وزارتیں باقی نہیں ہیں ان کے خلاف تحقیقات کرنا بے حاصل ہے۔

مطالبہ نمبر ۱ کے متعلق وائسرائے کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ شاید اس مطالبہ کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کی حفاظت کے لئے بھی مسلمان سپاہیوں سے کام نہ لیا جائے اس کی مسٹر جناح نے دوبارہ تشریح کردی کہ اس مطالبہ سے مسلمانوں کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان فوجیوں کو ہندوستان کے باہر کسی اسلامی ملک پر چڑھائی کرنے کے لئے نہ بھیجا جائے اس تشریح کے بعد یقیناً وائسرائے کو اسے تسلیم کر لینے میں کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔

حکومت ہند کے ساتھ لیگ کی گفت و شنید کا نتیجہ تو یہ تھا لیکن کانگریس اور لیگ کی گفت و شنید کا نتیجہ کچھ نہ نکلا، اس لئے کہ کانگریس ہندو مسلمانوں کے فروعی اختلافات پر گفتگو کرنی چاہتی تھی، لیگ کو دستور ۱۹۳۵ء کے بنیادی اصول سے اختلاف تھا۔ کانگریس ہندوستان میں ایک قوم فرض کر کے اکثریت اور اقلیتوں کے اصول پر دستور جدید کا خاکہ تیار کرنی چاہتی تھی لیگ کا نقطہ نظر یہ تھا کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں آباد ہیں جدید دستور میں دونوں قوموں کی انفرادیت کے تحفظ کی طمانیت ہونی چاہیئے۔ کانگریس جدید دستور کی ترتیب اور تدوین کے لئے "کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی" کا مطالبہ کر رہی تھی، اور مسلم لیگ کے نزدیک اس طرح کی نمائندہ اسمبلی کی ترتیب ہی ناممکن تھی جس میں ہر قوم کی پوری پوری نمائندگی اور اس کے مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ ظاہر ہے لیگ اور کانگریس کے نقطہ نظر میں ان بنیادی اختلافات کے بعد دونوں جماعتوں میں مفاہمت کیوں کر ہو سکتی تھی۔ ؟ لیکن چونکہ بغیر مفاہمت کے ہندوستانی سیاست کی موجودہ پیچیدگیاں کبھی دور نہیں ہو سکتی تھیں اس لئے لیگ اور کانگریس کے نمائندوں نے دوبارہ ان اختلافات پر کسی قریبی فرصت میں ایک دوسرے کے ساتھ ملکر غور کرنے کا وعدہ کر لیا، لیکن یہ فرصت کا وقت بدقسمتی سے آ ہی نہ سکا اس لئے کہ اس وعدے وعید کے کچھ دنوں بعد حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ کانگریس اور لیگ میں اور زیادہ دوری ہو گئی اور مسلم لیگ ہندوستان کی سیاست پر چھا گئی۔

تیسواں باب

کانگرسی وزارتوں پر فرد قرار داد جرم!

کانگرسی وزارتوں میں مسلمانوں کے خلاف جو بے انصافیاں ہوئی تھیں اور جس جس انداز سے وہ ہندوؤں کی زیادتیوں کا شکار ہوئے تھے اس کی تحقیقات کے لئے مسلم لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی جس نے اپنی رپورٹ شائع کر دی یہ "پیر پور رپورٹ" کے نام سے مشہور ہے لیکن اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد کانگرس نے مسلمانوں کی جائز شکایات کو نہ صرف یہ کہ تسلیم نہیں کیا اور پیر پور رپورٹ کی دریافت شدہ شکایتوں کی مہمل اور دور از کار تاویلیں تراشیں بلکہ بعض شکایتوں کا مذاق اڑایا اور ان حضرات کو جنہوں نے یہ رپورٹ مرتب کی تھی طرح طرح سے متہم کیا۔

کانگرسیوں کا یہ رویہ دیکھ کر مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال نے انہیں ٹوکا اور یہ اعلان کیا کہ مسلمانوں پر ہندو صوبوں میں جو ظلم کئے گئے ہیں وہ انہیں ثابت کر سکتے ہیں اس لئے کانگرس کے لئے بہتری اسی میں ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو تسلیم کرے اور بات نہ بڑھائے لیکن کانگرسیوں نے مولوی فضل الحق کی اس نصیحت کا بھی مذاق اڑایا۔ اور انہیں چیلنج دیا

کہ وہ زیادتیوں کو شائع کر دیں۔ مولوی فضل الحق نے اس کے بعد بھی طرح دی اور شکایتوں کو اس لئے شائع نہیں کیا کہ اس سے ہندو مسلمانوں کے تعلقات میں مزید تلخی نہ پیدا ہو جائے لیکن جب جواہر لال نہرو جیسے ذمہ دار کانگرسی لیڈر نے مولوی فضل الحق کا مذاق اڑایا اور ان پر یہ آوازہ کسا کہ ثبوت تو مسلمانوں کی شکایتوں کا ان کے پاس ہے نہیں یہ خواہ مخواہ کو ملک کی فضا خراب کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے مجبور ہو کر "صرف چند" شکایتیں ثبوت کے ساتھ اخبارات میں شائع کر دیں یہ چند شکایات اسٹیٹسمین جیسے اخبار کے تقریباً دس کالموں میں سما سکی ہیں ان شکایتوں کو پیش کرتے ہوئے مولوی فضل الحق نے یہ بھی دعوے کیا کہ اگر ان مختصر سی شکایات سے پنڈت جواہر لال نہرو کی تشفی نہ ہو سکے تو وہ اس سے بھی زیادہ شکایتیں ثبوت کے ساتھ پنڈت جی کی خدمت میں پیش کر سکتے ہیں۔

لیکن ان شکایتوں کے شائع ہونے کے بعد نہ صرف یہ کہ پنڈت جواہر لال کو مولوی فضل الحق کا مذاق اڑاتے کی جرأت نہیں ہوئی بلکہ ان کا کوئی جواب ہی ان سے نہ بن پڑا اور کانگرسی پریس اور کانگرسی حلقوں میں سناٹا چھا گیا۔

یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم ان شکایتوں کو درج کریں جو مولوی فضل الحق نے گنائی ہیں البتہ خود مولوی فضل الحق کے بیان کے کچھ تھوڑے سے اقتباسات یہاں پیش کئے جاتے ہیں تاکہ کانگرسی وزارتوں پر جو الزام مولوی فضل الحق نے لگائے ہیں ان کی نوعیت کا علم ہو سکے۔ مولوی صاحب فرماتے ہیں :-

"کانگرسی وزارتوں نے عہدے سنبھالنے کے ساتھ ہی بعض انوکھی حرکتیں کیں انہوں نے مقامی حکام کے نام تحریری اور زبانی ہدایات جاری کر دیں کہ اہم معاملات میں وہ اپنے ہاں کی کانگرس کمیٹی کے عہدہ داروں سے مشورہ حاصل کر لیا کریں۔ انہوں نے احکام جاری کئے کہ پبلک عمارتوں اسکولوں اور دوسرے مقامات پہ کانگرسی جھنڈے نصب کئے جائیں بہت سے وزراء نے نہایت ہی تزک و احتشام کے ساتھ مفصلات اور قصبات میں کانگرسی جھنڈے لہرانے کے لئے دورے کئے اور مسلمانوں کے احتجاج کے باوجود اسکا تسخر کر کے یہ احکام نافذ کئے اور اجازتیں دیں کہ ہر تقریب پر کانگرس کا ترانہ بندے ماترم گایا جائے۔ انہوں نے ہندی زبان کو رواج دیا اور اس کی ہمت افزائی کی یہانتک کہ مدارس میں "تمام طلباء کے لئے اس کا پڑھنا لازمی قرار دیا"

—————— "انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنے منصوبوں کی مسلمانوں سے جبراً تعمیل کرائیں گے۔ ان کے منصوبے کیا تھے؟ مختصراً یہ کہ:-

(۱) گئو ماتا کی بہرصورت رکھشا ہونی چاہیئے اسی بناء پر مدنا پور، بلیا اور دیگر مقامات میں قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا گیا۔

(۲) مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی اجازت نہ دینی چاہیئے چنانچہ اس مقصد کو سامنے رکھ کر تلوکری میں وحشیانہ اور انسانیت سوز مظالم کئے گئے۔ اور اسی طرح دوسرے کثیر التعداد

مقامات پر خوں ریزیاں روا رکھی گئیں جن کی حقیقت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔

(۳) مسلمانوں کے مذہب کو پامال کر دینا چاہئے کیونکہ یہ دیش ہندوؤں کا ہے اس منصوبے کو پورا کرنے کے لئے اذانیں روکی گئیں، مساجد میں نمازیوں پر حملے کئے گئے، نماز کے اوقات میں مسجدوں کے سامنے سے شور و غوغا کرتے ہوئے باجے کے ساتھ فاتحانہ انداز میں جلوس گذارے گئے اور ایسی بہت سی نئی نئی باتوں کو رواج دیا گیا تاکہ سناتن دھرم کی برتری کا سکہ بٹھانے کے موقع پیدا کئے جائیں اسی نہیہ کے بموجب بقر عید کے موقعوں پر گائے کی قربانی کو جبریہ روکا گیا، اور مسلمانوں کے قبرستانوں مسجدوں اور دوسرے مقدس و محترم مقامات کی بے حرمتی کی گئی"۔

"کانگریس کے خلاف جو کچھ پیش کیا جارہا ہے وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے، ہیں نے ارادتاً ہندی کی تحریک میں شدت، ودیا مندر اسکیم کے نفاذ، مقامی با اختیار اداروں (مثلاً ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی) میں جو تھوڑے بہت مسلمان تھے ان کو بالکل ہی معدوم کر دینے کی کوشش، اردو اسکولوں کی پامالی، ہندو تمدن کی فوقیت دکھانے کے لئے مدارس میں قابل اعتراض درسی کتابوں کی ترویج اور خالص مسلم مدارس کے لئے اپنی کتابوں کی منظوری اور متعدد دوسرے ایسے معاملات کا جو مسلمانوں کی

طرف سے کانگرسی حکومت کے خلاف عائد کردہ فردجرم میں شامل ہیں
یہاں کوئی ذکرنہیں چھیڑا گیا مگر جب کسی عدالت مجاز کے سامنے معاملا
پیش ہوں گے تو ان مذکورہ بالا شکایات کی تفصیلات بھی اسوقت
پیش کردی جائیں گی۔"

اس تمہیدی بیان کے ساتھ مولوی فضل الحق نے کانگرسی حکومتوں پر پورے
ڈیڑھسو الزامات لگائے ہیں جن میں سے کسی ایک کی بھی کانگرس کی طرف سے تردید
نہ ہوسکی۔

ایک طرف مولوی فضل الحق نے کانگرسیوں پر یہ فردجرم لگائی دوسری
طرف مسٹر جناح نے یہ اعلان کردیا کہ ہندوستان کے طول وعرض میں ۲۲ردسمبر
۱۹۳۹ء کو کانگرسی وزارتوں سے چھٹکارا ملنے کی خوشی میں یوم رستگاری
منایا جائے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی کانگرسی حلقوں میں شدید بےچینی ہوگئی
اور ہر طرف سے مسٹر جناح پر یہ دباؤ ڈالا جانے لگا کہ اس اعلان کو منسوخ
کردیجیے لیکن جب مسٹر جناح کسی طرح اپنے اعلان کو واپس لینے پر تیار نہ
ہوئے تو کانگرس نے اپنے حمایتی مولویوں کے ذریعہ "یوم رستگاری" کو
بےاثر بنانے کی کوشش کی لیکن ان انتہائی مخالفانہ کوششوں کے باوجود
ہندوستان کے ہر صوبے میں یوم رستگاری منایا گیا اور مسلمان اس
دوران میں پوری طرح منظم رہے جسکا ثبوت یہ ہے کہ کہیں اس موقع پر فساد
نہیں ہوا۔

یوم رستگاری نہ صرف مسلمانوں نے منایا بلکہ ملک کی اقلیتیں اور ہندو
تک اس میں شامل تھے۔ بمبئی میں اس موقع پر جو جلسہ مسٹر محمد علی جناح کی
صدارت میں ہوا اس میں تقریباً (۲۰۰) ہزار مسلمان، ہندو، اچھوت اور

پارسیوں نے شرکت کی اور ان سب قوموں کے نمائندوں نے تقریریں بھی کیں۔

"یوم ستگاری" کے بعد ظاہر ہے لیگ اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کی گفتگو کا کوئی قرینہ باقی نہیں رہا تھا چنانچہ کانگرس نے یہی عذر درمیان میں رکھ کر اس سلسلہ کو ختم کر دیا۔

اکتیسواں باب [۳۱]

آزادی کامل کی دھمکی۔ کیکسٹن ہال کا سانحہ

وزارتوں سے مستعفی ہو جانے کے بعد کانگرسی حلقوں میں یہ بحث چھڑ گئی کہ کانگرس کا دوسرا قدم کیا ہونا چاہیئے؟ بایاں بازو، سول نافرمانی کو فوراً شروع کر دینے کے حق میں تھا لیکن گاندھی جی اور ان کی جماعت اس کیلئے تیار نہیں تھی۔ اس لئے کہ جنگ کے دوران میں سول نافرمانی کے معنی "مخاصمانہ اقدام" کے لے جائیں گے اور ایسے اقدام کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جائیگا جو دشمن سے رکھا جاتا ہے۔ اور کانگرس ابھی اس قدر منظم نہیں ہے کہ حکومت کی اس ٹکر کو جھیل جائے۔ چنانچہ طے یہ پایا کہ "سول نافرمانی" کو بطور دھمکی استعمال کرنے کا اختیار گاندھی جی کو دیدیا جائے اور عملاً کوئی پروگرام اس سلسلہ میں نہ بنایا جائے۔ چنانچہ اس تصفیہ کے مطابق گاندھی جی نے کانگرس کے آئندہ اقدام کے متعلق متعدد بیانات پریس کو دئے جس میں حکومت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا پورا پورا اہتمام رکھا، ان کے بیانات کے جواب میں وزیر ہند اور وائسرائے نے بھی بیانات شائع کئے جن میں اعلان کیا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد حکومت برطانیہ ہندوستان کے لئے ذمہ دار

حکومت منظور کرے گی۔ لیکن کانگرس کا مقصد ان بیانات سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا وہ چاہتی تھی کہ حکومت یہ اعلان کر دے کہ ہندوستان کے لئے جدید دستور مرتب کرنے کا کام کانگرس کے سپرد کر دیا جائیگا حکومت یہ نہیں کر سکتی تھی اس نے صاف لفظوں میں انکار کر دیا۔ کانگرس نے اس پر ایک قدم اور آگے بڑھایا اور پٹنہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں رام گڑھ کے سالانہ اجلاس میں پیش کرنے کے لئے یہ قرارداد منظور کی:۔

"ہندوستان آزادی کامل سے کم کوئی چیز قبول نہیں کر سکتا"

کانگرس کی یہ دوسری دھمکی تھی، خیال ہوا کہ حکومت برطانیہ پر اس کا اثر خاطر خواہ ہوگا چنانچہ اس قرارداد کا ذکر کرتے ہوئے گاندھی جی نے حکومت برطانیہ کو یہ یقین دلایا کہ گفت و شنید کا دروازہ ابھی تک کھلا ہوا ہے حالانکہ "آزادی کامل" کے بعد کوئی بات ہی باقی نہیں رہتی جس کے لئے گفت و شنید کی ضرورت ہو۔

"آزادی کامل" کی تحریک کانگرس نے یہ تیسری مرتبہ منظور کی ہے پہلی مرتبہ ۱۹۲۷ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے مدراس کانگرس میں پیش کی لیکن کچھ ہی دنوں بعد "نہرو رپورٹ" جیسی ناقص اسکیم کو منظور کر کے دکھا دیا کہ آزادی کامل کا مفہوم کانگرس کے نزدیک کیا تھا۔ دوسری مرتبہ ۱۹۲۹ء میں یہ پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں لاہور میں منظور ہوئی۔ جس کے بعد گول میز کانفرنس میں "ڈومنین اسٹیٹس" کے لئے جھگڑا ہوتا رہا۔ گول میز کانفرنس کا نتیجہ موجودہ دستور تھا، کانگرس نے طے کیا اس کو رد کیا جائیگا مگر پھر اسے قبول کر لیا نہ صرف قبول کر لیا بلکہ اپنے امکان بھر کامیاب بنا دیا۔ اب پھر "آزادی کامل" کی تجویز کانگرس کے بڑے اجلاس میں منظور ہونے والی ہے،

دومرتبہ 'آزادی کامل' کی تجویزوں کا حشر دیکھنے کے بعد، حکومت کی نظروں میں اس تجویز کی وقعت کیا ہوگی؟ یہ تو عنقریب ظاہر ہوجائیگا۔ دیکھنا اس وقت یہ ہے کہ "آزادی کامل" سے فی الحقیقت کانگریس کا مقصود کیا ہے؟ پچھلے دومرتبہ کا تجربہ تو وہ تھا جو ہم نے اختصار کے ساتھ اوپر درج کردیا؛ اس دفعہ کانگریس کا اصلی مقصد بہ ظاہر "کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی" قائم کرانا ہے تاکہ یہی جماعت ہندوستان کے لئے نیا دستور مدون کرے۔ یہ "کانسٹیٹوئنٹ اسمبلی" کیا چیز ہے؟ ہندوستان میں قائم بھی ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اور اس کے ذریعہ ہندوستان کے مختلف قوموں کے سیاسی حقوق کی حفاظت بھی کی جاسکتی ہے یا نہیں؟ یہ سوالات فی الحقیقت بڑی اہمیت رکھتے ہیں جنہیں براہ راست مسلم سیاست سے تعلق ہے اور جن کا سمجھنا ضروری ہے۔

اس جگہ ہم مسٹر جناح کے ایک بیان کے کچھ اقتباسات درج کردیتے ہیں جن میں کانگریس کے نمائندہ اسمبلی کے مطالبہ پر نہایت خوبی سے روشنی پڑتی ہے۔ مسٹر جناح انگلستان کے مشہور اخبار "ڈیلی میل" کو ایک بیان دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"مسٹر گاندھی برابر اقلیتوں کو نظر انداز کررہے ہیں۔ وہ خودمختاری کا مطالبہ کرتے ہیں ان کے اس مطالبہ پر بھی کوئی اعتراض نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس ناقابل اعتراض نصب العین کو کیونکر پورا کرنا چاہتے ہیں؟ مسٹر گاندھی جتنی باتیں کہتے ہیں ان کے باوجود وہ حکومت برطانیہ سے درخواست کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ ہمارے نصب العین کو پورا کردے۔ ان کی تجویز ہے کہ ہندوستان کی ایک "نمائندہ اسمبلی" ایک ایسا دستور بنانے کے لئے بلائی جائے

جس میں جائز اقلیتوں کے پورے پورے اطمینان کا سامان شامل ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس اسمبلی کو کون جمع کرے؟ اور پھر جب وہ اسمبلی ایسے اعلیٰ ترین اور نہایت ہی غیر جانبدار ٹریبونل کی مدد سے جس کا تخیل انسانی ذہن میں آسکتا ہے اپنے نتائج مرتب کرے گی اسوقت ان نتائج کو کون عملی جامہ پہنائیگا؟ اسوقت مسٹر گاندھی کے سامنے اقتدار برطانیہ کے سوا کوئی دوسری سند موجود نہیں ہے!"———— "مسٹر گاندھی حقیقت میں حکومت برطانیہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ حکومت برطانیہ کانگرس کی درخواست پر بقیہ ملک کے سر ایسی خود مختار اور ایسا طریقہ حکومت خود اختیاری منڈھ دے جسے کانگرس نے مدون کیا ہو۔ اگر مسٹر گاندھی عقل کے مطابق کام کرنے چاہتے ہیں تو انہیں مطالبہ کرنا چاہیئے کہ فوراً برطانیہ کی ذلت آفرین سنگینیں ہندوستان سے ہٹالی جائے تاکہ جمہور ہند مکمل آزادی و خود مختاری کی حالت میں اپنے حق خود اختیاری کے استعمال کا طریقہ طے کرسکیں لیکن مسٹر گاندھی ایسا مطالبہ حکومت برطانیہ سے نہیں کرتے کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر ان حالات میں کانگرسی ٹولی نے اپنا موجودہ نصب العین جمہور ہند کے سر منڈھنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

کانگرس کے موجودہ نصب العین "آزادی کامل" کی یہ تفسیر جاننے کے بعد یقیناً اس تجویز سے کسی کو دلچسپی باقی نہیں رہ سکتی۔ البتہ یہ تجویز رام گڑھ میں منظور ہوکر حکومت کے خلاف بطور دھمکی ضرور استعمال کی جاسکتی تھی، لیکن

کانگرس کی بدقسمتی سے اسی ہفتہ جس ہفتہ رام گڑھ کا اجلاس ہونیوالا ہے لندن میں "کیکسٹن ہال" کا افسوسناک واقعہ پیش آگیا جس سے لندن کے سرکاری اور غیر سرکاری حلقوں میں انتہائی ناگواری پیدا ہوگئی ہے۔ اگرچہ اس واقعہ کو کوئی سیاسی اہمیت نہیں دی جارہی ہے لیکن بہرحال اس واقعہ کے پیدا کردہ تاثرات کو محسوس کرتے ہوئے اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور پھر اس واقعہ کو ہندوستان سے براہ راست تعلق ہے سر مائیکل اوڈوائر پنجاب کے گورنر رہ چکے تھے، جو ہلاک ہوئے، لارڈ لمنگٹن صوبہ بمبئی کے سابق گورنر تھے، یہ شدید زخمی ہوئے، اور لارڈ زٹلینڈ تو آج کل وزیر ہند ہیں یہ بھی اس حادثہ میں زخمی ہوگئے۔ گویا اتفاق سے یہ سب حضرات وہ ہیں جنہیں ہندوستان سے تعلق تھا اس اعتبار سے چاہے اس واقعہ کو سیاسی اہمیت ہو یا نہ ہو لیکن لندن کی فضا کو ضرور مسموم کردیا جس کے باعث غالباً اس میں کانگرس کی "دھمکی" سے متاثر ہونے کی صلاحیت "کمزور" ہوگئی!

تیئسواں باب

مسلم لیگ کا مطمح نظر

"لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے؟ اگر آپ ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکے کہ ہماری منزل مقصود کیا ہے تو میں یہ کہونگا کہ آپ کبھی بھی اپنی منزل مقصود نہیں جان سکتے!

برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنی چاہتی ہے اور مسٹر گاندھی ہندوستان اور مسلمان دونوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں! ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے نہ مسٹر گاندھی کو۔ ہم ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں!! (محمد علی جناح)

مسلم لیگ کا سیاسی مطمح نظر اختصار کے ساتھ اوپر کی چار سطروں میں پیش کیا جا سکتا ہے، اور تفصیل سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے مسٹر محمد علی جناح کے اس بیان کا مطالعہ کافی ہے جو انہوں نے کچھ دنوں پہلے انگلستان کے اخبار "ٹائم اینڈ ٹائیڈ" کو دیا تھا۔ اس بیان کے ضروری اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان کا سیاسی مستقبل کیا ہے؟ حکومت برطانیہ کا معینہ مقصد یہ ہے کہ ہندوستان عملی طور پر کم سے کم وقت میں قانون ولیسٹ منسٹر کے مطابق ڈومنین اسٹیٹس سے بہرہ اندوز ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے حکومت برطانیہ بالکل طبعًا ہندوستان میں اس قسم کا جمہوری دستور نافذ دیکھنا پسند کرے گی۔ جس سے وہ سب سے زیادہ واقف ہے اور جسے وہ بہترین تصور کرتی ہے جس کے ماتحت ملک کی حکومت انتخابات کے نتیجہ کے مطابق ایک یا دوسری سیاسی پارٹی کے حوالہ کردی جائے۔

لیکن ہندوستان کے حالات کے متعلق برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین بھی اس قدر لاعلم ہیں کہ ماضی کے تمام تجربات کے باوجود اب بھی نہیں سمجھ سکے کہ اس قسم کا طرز حکومت ہندوستان کے لئے نہایت ناموزوں ہے۔ وہ جمہوری نظام جو انگلستان کی طرح ایک نسل والی قوم کے تصور پر مبنی ہو ہندوستان جیسے مختلف النسل ممالک پر قطعًا چسپاں نہیں ہو سکتے۔ اور یہ سیدھا سادھا واقعہ ہندوستان کی تمام دستوری بیماریوں کا بنیادی سبب ہے"۔ ——— "ہندوستانی مسائل کا مطالعہ ہندوستانی دستوری اصلاحات سے متعلق جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے سیشن ۳۴-۱۹۳۳ء کی رپورٹ کی جلد اول کے پہلے پیرہ کے مطالعہ سے شروع کرنا چاہئے تھا جس میں لکھا ہے کہ:-

ہندوستان میں بہت سی نسلیں آباد ہیں۔ جو اکثر اپنی اصلیت، روایات، اور طرز زندگی کے لحاظ سے ایک دوسری سے اس قدر ممیز ہیں جس قدر کہ یورپ کی اقوام۔ اس کے دو تہائی باشندے کسی نہ کسی شکل میں ہندویت کو اپنا مذہب مانتے ہیں۔ سات کروڑ ستر لاکھ سے زیادہ اسلام کے پیرو ہیں اور ان دونوں کے درمیان جو فرق ہے وہ سخت تر مفہوم کے لحاظ سے مذہب ہی کا فرق نہیں ہے۔

بلکہ شریعت اور کلچر میں بھی مختلف ہیں واقعہ یہ ہے کہ وہ دو ممیز اور جداگانہ تہذیبوں کے نمائندے ہیں۔ ہندومت اپنی ذات پات کے مظاہرہ سے پہچانی جاتی ہے، جو اس کے مذہبی اور معاشرتی نظام کی بنیاد ہے اور ایک بہت ہی محدود میدان کو چھوڑ کر اس پر مغربی دنیا کے فلسفوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ہے۔ دوسری طرف مذہب اسلام انسانی مساوات کے تصور پر مبنی ہے۔ اغلباً ہندوستان کے متعلق اس سے زیادہ صحیح بیان ایک پیراگراف میں کہیں اور قلمبند نہیں کیا گیا ہے۔ اور اس پس منظر کے بغیر ہندوستانی مسائل کو سمجھنا ممکن نہیں ہے۔ جمہور برطانیہ کو سمجھنا چاہیے کہ ہندومت اور اسلام "دو ممیز اور جداگانہ تہذیبوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ ہے۔ کہ اقوام یورپ کی طرح اپنی اصلیت اور روایات اور طرز زندگی کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممیز ہیں"

"واقعہ یہ ہے۔ کہ وہ دو مختلف اقوام ہیں۔ اور اگر اس واقعہ کو جوائنٹ سلیکٹ کمیٹی جیسی جماعت مجاز قبول کر چکی ہے۔ تو اس کے بعد مسلمان قوم کے پاس حکومت برطانیہ کی اس خیال میں اعتراض کرنے کی وجہ موجود ہے کہ وہ ہندوستان پر ان شرطوں اور تحدیدات کے بغیر مغربی طرز کی جمہوریت ٹھونسنا چاہتی ہے جو اس پر عائد ہونی چاہئیں تاکہ مغربی جمہوری طرز کو ہندوستان کے حالات کیلئے موزوں بنایا جا سکے۔ لہذا اگر یہ بات قبول کر لی جائے کہ ہندوستان میں ایک قوم زیادہ تعداد والی ہے اور ایک قوم کم تعداد والی تو اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک ایسا پارلیمنٹری نظام جو اکثریت کی حکومت کے اصول پر مبنی ہو مرتب کیا جائے جس کے معنے لازمی طور پر یہی ہوں گے کہ زیادہ تعداد والی قوم حکومت کیا کرے۔ تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ کسی پولٹیکل پارٹی کا اقتصادی اور سیاسی پروگرام چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو ہندو قاعدہ کلیہ کے طور پر اپنی ہی ذات والے کو ووٹ دیگا۔

اور مسلمان اپنے مذہب ہی کو ووٹ دے گا!!"

——— "مسٹر گاندھی جو صف اول کے ایک ہوشیار ہندو سیاست داں ہیں، ان کی قیادت میں کانگرس نے (جو خاص طور پر ایک ہندو جماعت ہے) بہت دنوں پہلے پیش بینی کر لی تھی۔۔ کہ مغربی طرز جمہوریت کے اندر ہندوؤں کے لئے تمام ہندوستان پر مستقل غلبہ پانے کی امیدوں کی تکمیل کا سامان۔ پوشیدہ ہے۔ چنانچہ ان کی تمام کوششیں اور قوتیں اس طرف لگ گئی تھیں۔ کہ ہندوستان کے لئے ایک بالکل جمہوری طرز حکومت حاصل کیا جائے اور انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر نئے دستور کو ان اصولوں پر چلایا جا سکے۔ جو ان کے لیڈر اور ورکنگ کمیٹی نے قائم کئے تھے تو نیا دستور ہمیں منزل مقصود کے بہت ہی زیادہ قریب پہنچا دیگا۔ لہذا جہاں کانگرس یہ چلاتی رہی۔ کہ جدید دستور قطعاً ناقابل اطمینان اور بالکل ناقابل قبول ہے۔ وہیں اس نے دستور جدید کے آغاز سے قبل منعقد ہونے والے انتخابات لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اور جیسا کہ ہونا لازمی تھا۔ ہندوستان کے چھ ہندو صوبوں، یعنی بمبئی۔ مدراس یوپی۔ بہار اوڑیسہ میں مکمل اکثریتیں حاصل کر لیں"——— "اب ہم مبہم اور ناقابل عمل آئینی اسمبلی کے مضرات پر غور کرتے ہیں اور اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں اس کا مطالبہ محض اسی وقت کیا جا رہا ہے جواب بالکل ظاہر و باہر ہے۔ جنگ کانگرس کمیٹی کے لئے بہترین موقع ہے۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی حکومت ۸ صوبوں میں سے بڑھا کر تمام ہندوستان جس میں صوبے اور ریاستیں سبھی شامل ہیں وسیع کرے۔ اگر برطانوی حکومت اچانک طور پر ہراساں ہو گئی اور جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ صورت حالات کے تنکوں سے ڈھکے ہوئے گڑھے میں گر گئی تو ہندوستان کو سخت نزاکت کا سامنا

کرنا پڑیگا جس کے نتیجہ کے متعلق کوئی شخص پیش گوئی نہیں کرسکتا اور میں یقیناً یہ محسوس کرتا ہوں کہ اسلامی ہندوستان کبھی بھی ایسی پوزیشن نہیں ہونے دیگا اور اپنی تمام قوت و ذرائع سے جو اسے حاصل ہیں اس کی مدافعت کرنے پر مجبور ہوگا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ آئینی اسمبلی کس قسم کے واضعین قانون پر مشتمل ہوگی؟ ہندوستان میں ایسے ہی اندازہ کے موافق ۴ کروڑ نفوس موجود ہیں جو دابوس کن طریق پر بالکل ان پڑھ ہیں۔ لیکن یہ چیز ان کی کسی اپنی غلطی یا قصور سے نہیں ہے۔ نتیجہ ایسے لوگوں پر مہنتوں اور ذات پات کا غلبہ ہے انہیں مطلق اس چیز کا علم نہیں کہ ان پر کس طرح آجکل بھی حکومت کی جارہی ہے اور یہ تجویز کیا گیا ہے کہ اس قسم کے منتخب شدہ نمائندگان ہوں۔ کیا ہندوستان کے آئندہ آئین پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ کہنا ناکافی ہے کہ اس حالت میں جب کہ منتخب شدہ نمائندگان کی ایک بہت بڑی اکثریت ان پڑھ ہندوؤں پر مشتمل ہوگی تو آئینی اسمبلی مسٹر گاندھی اور کانگرسی لیڈروں کے اثر و اقتدار کے نیچے ہوگی اور جو آئین مرتب ہوگا وہ بالکل کانگرس ورکنگ کمیٹی کی مرضی کے مطابق ہوگا۔

پس آئینی اسمبلی کے ذریعہ ورکنگ کمیٹی کیا اپنے مقاصد حاصل کرلے گی برطانوی کنٹرول اور کامرس مفقود ہو جائے گی ہندوستانی ریاستوں کا خاتمہ کر دیا جائیگا۔ اقلیت اپوزیشن مطمئن ہو جائے گی اور ایک بہت بڑی ہندو قوم پیدا ہو جائے گی جس پر اس کا پیارا لیڈر مسٹر گاندھی اور کانگریس ورکنگ کمیٹی حکومت کرے گی۔

اب ہم نے مرض اور اس کی علامات پر غور کر لیا ہے اس کا علاج کیا ہے۔

(۱) برطانوی لوگ ضرور اس حقیقت کو پہچانیں کہ مغرب کی غیر مشروط جمہوریت ہندوستان کے لئے قطعاً نامناسب ہے اور اسے ٹھونسنے کی تمام کوششیں بالکل بند کر دینا چاہئیں۔

(۲) یہ بات بھی قطعاً تسلیم کر لی جائے کہ ہندوستان کے لئے پارٹی گورنمنٹ موزوں نہیں ہے۔ تمام حکومتیں چاہے وہ مرکزی ہوں یا صوبجاتی - ایسی حکومتیں ہونی چاہئیں جو عوام کے تمام طبقات کی نمائندہ ہوں۔

اس سلسلہ میں آل انڈیا مسلم لیگ نے مندرجہ ذیل اصول پیش کئے ہیں۔

(۱) موجودہ صوبجاتی آئین پر عمل کرنے سے جو تجربہ ہوا ہے اس کی بعد ۱۹۳۹ء سے جو حالات رونما ہوئے ہیں یا جو اس کے بعد رونما ہونے والے ہیں ان سب کی روشنی میں برطانوی حکومت ہندوستان کے تمام آئینی مسئلہ پر غور اور نظرثانی کرے۔

(۲) گو مسلم لیگ ایک آزاد ہندوستان کی متمنی ہے مگر وہ کسی فیڈرل مقصد کے شدید خلاف ہے جس کا لازمی نتیجہ ڈیموکریسی اور پارلیمنٹری طریق کی حکومت کے نام پر اکثریت کا راج ہوگا۔

(۳) ہندوستان کی آئینی ترقی کے مسئلہ کے متعلق کوئی اعلان آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر نہ کیا جائے اور نہ اس طرح کی منظوری و تصدیق کے بغیر برطانوی پارلیمنٹ اور ملک معظم کی حکومت کوئی دستور مرتب کرے۔

خاتمہ کلام یہ کہ ایک ایسا آئین مرتب ہو جو یہ تسلیم کرے کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں اور یہ دونوں اپنے مادر وطن پر حکومت کرنے میں برابر کے حصہ دار ہوں اس قسم کا آئین مرتب کرنے میں مسلمان برطانوی گورنمنٹ، کانگریس یا کسی پارٹی سے تعاون کرنے پر تیار ہیں تاکہ موجودہ [illegible] ختم

ہو جائے اور ہندوستان کو دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں جگہ حاصل ہو جائے"

اگرچہ مسلم لیگ کے علاوہ اس وقت ملک میں اور بھی مسلم جماعتیں پائی جاتی ہیں مثلاً جمعیتہ العلماء یا احرار لیکن ان میں سے چونکہ کسی جماعت کو بھی مسلم اکثریت کی حمایت حاصل نہیں ہے اور نہ ان جماعتوں نے اپنا کوئی تعمیری لائحہ عمل ملک کے آگے پیش کیا ہے اس لئے یہاں ان کے مسلک کی مزید تشریح بے ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ بیچ میں کئی وقفوں کے بعد ۱۹۳۴ء سے پھر ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا فرض مسلم لیگ انجام دے رہی ہے اور یہی اس وقت چونکہ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت سمجھی جاتی ہے اسلئے فی الحقیقت اسی کی سیاست موجودہ دور کی مسلم سیاست ہے۔

ختم شد

(کتبہ عبد الحفیظ دہلوی)

محبوب المطابع برقی پریس دہلی

کتب خانہ علم و ادب کی ہردلعزیز مطبوعات

لالہ رُخ (مصور ایڈیشن) مصنفہ طامس مور
مترجمہ ل۔ احمد اکبر آبادی۔ قیمت مجلد ۲؎ ۸ر

اتاترک (مصور) آل عثمان سے لیکر عصمت انونو
صدر جمہوریہ ترکیہ تک کی مکمل تاریخ۔ از محمود مرزا قیمت عگار

سات تارے۔ سات مشہور افسانہ نگاروں کے
ایک پلاٹ پر شاہکار افسانے قیمت مجلد عہر

فاؤسٹ۔ گوئٹے کی مشہور عالم تصنیف اردو
کے لباس میں ترجمہ شاہد احمد بی۔ اے ایڈیٹر
رسالہ ساقی۔ قیمت عہر

مضامین فراق۔ حکیم خواجہ سید ناصر نذیر فراق
دہلوی مرحوم کا بے مثل مجموعہ مضامین۔ قیمت عدر

بہادر شاہ اور پھول والوں کی سیر مصنفہ
مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی۔ قیمت ۶ر

خطوط کی ستم ظریفی۔ مصنفہ مرزا عظیم بیگ
چغتائی۔ قیمت ۸ر

دکن کی پری۔ حضرت فراق دہلوی مرحوم
کا مختصر ناول۔ قیمت ۶ر

طوفان ظرافت۔ سراج الدین احمد دہلوی کے
مزاحیہ قصائد کا مجموعہ۔ قیمت ۶ر

کھرپا بہادر۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی کا نہایت
دلکش ناول جسے پڑھ کر آپ شرر لکھنوی کے
دربار حرام پور کو بھول جائیں گے۔ قیمت عدر

بیگموں کی چھیڑ چھاڑ۔ یہ بھی فراق مرحوم کا
اپنے خاص ڈھنگ کا افسانہ ہے۔ قیمت سہر

دلی کا اجڑا ہوا لال قلعہ۔ از حکیم خواجہ
سید ناصر نذیر فراق۔ قیمت سہر

سات طلاقنوں کی کہانیاں۔ یہ بھی فراق
مرحوم کی سات دلکش کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ قیمت سہر

عشق کی گولیاں۔ از مرزا فرحت اللہ بیگ
و سلطان حیدر جوش (علیگ) قیمت سہر

گمنام عورت کا خط۔ مترجمہ جناب ظفر قریشی
بی۔ اے۔ قیمت سہر

تماشا پہ تماشا۔ ناکارہ حیدر آبادی کا دلچسپ
افسانہ۔ قیمت سہر

خواب پریشاں۔ مولانا عنایت اللہ صاحب
کا معرکۃ الآرا طبعزاد مضمون۔ قیمت سہر

انکشاف حقیقت۔ مسٹر صادق الخیری ایم اے دہلوی کا نہایت دلچسپ افسانہ قیمت ۴ر

ملک العزیز ورجنا۔ مولانا شرر مرحوم کا مشہور ناول (لائبریری ایڈیشن) قیمت عہ ر

شہید وفا۔ یہ بھی شرر مرحوم کا ایک دلکش ڈرامہ ہے (لائبریری اڈیشن) قیمت ۸ ر

توبۃ النصوح۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کی مشہور تصنیف۔ قیمت قسم اعلیٰ (عہ) قسم دوم ۱۰ آنہ

مرآۃ العروس۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کی وہ معرکۃ الآرا تصنیف جو ابتک تقریباً دو لاکھ شائع ہو چکی ہے قیمت قسم اول ۱۲ ر قسم دوم ۸ ر

بنات النعش۔ (مرآۃ العروس کا دوسرا حصہ) یہ بھی ڈیڑھ دو لاکھ فروخت ہو چکا ہے قیمت قسم اول ۱۲ ر قسم دوم ۸ ر

چند پند۔ بچوں کے لئے مولوی نذیر احمد مرحوم کی بیش بہا نصیحتیں۔ آٹھواں ایڈیشن قیمت ۸ ر

دوشیزۂ صحرا (ناول) از صادق الخیری ایم اے دہلوی قیمت مجلد مع مصور گرد پوش عہ

بغداد کا سوداگر (ناول) از اشرف صبوحی۔ مجلد عہ

ایک کہانی۔ ہندوستان کے چھ مشہور ادیبوں نے اس کہانی کو مکمل کیا ہے۔ قیمت ۶ ر

ٹھوری تارا اکٹے چاند۔ (بچوں کے لئے) از اشرف صبوحی۔ قیمت ۲ ر

صبر یا شاہزادہ۔ از اشرف صبوحی۔ ۲ ر

لعل شہزادہ (بچوں کیلئے) 〃 〃 ۲ ر

شہزادہ نے نواز (بچوں کیلئے) 〃 〃 ۲ ر

گہوارۂ تبسم۔ ظریف دہلوی کی مزاحیہ غزلیات کا مجموعہ۔ قیمت ۴ ر

عروس ادب۔ قاضی عباس حسین کے دلکش افسانوں کا مجموعہ۔ قیمت عہ ر

مقدمۂ شعر و شاعری۔ از خواجہ الطاف حسین حالی۔ قیمت عہ ر

منتخب الحکایات۔ مولوی نذیر احمد صاحب مرحوم کی بچوں کے لئے بہترین تصنیف جو مختلف یونیورسٹیوں کی طرف سے نصاب میں داخل ہے آٹھواں ایڈیشن۔ قیمت ۸ ر

مسلمانان ہند کی حیات سیاسی۔ عہ ر

انسانی حقوق۔ قیمت عا ر

ملنے کا پتہ

کتب خانہ علم و ادب اردو بازار دہلی